بند دروازے

(بچوں کی کہانیاں)

واجدہ تبسم

www.taemeernews.com

۷۸۶

(جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں)

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۷

بار اوّل

جنوری ۱۹۷۹ء

قیمت ۱۵ روپے

تعداد اشاعت ایک ہزار

ناشر: ٹیپو سلطان اور سیرتِ بک سینٹر بمبئی ۵۸

طابع: سراج الدولہ

پاکستان میں جملہ حقوق محفوظ ہیں

پاکستان کا پتہ:- ادبی سیرت بک سینٹر ۹۴۳ عزیز آباد کراچی کے نام محفوظ ہیں

مصنفہ کا پتہ

ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ ۱۰ سنتاکروز ویسٹ

بمبئی ۵۴

www.taemeernews.com

۱۹۷۹ بچّوں کے سال کا

تحفہ

بند دروازے

(بچّوں کی کہانیاں)

واجدہ تبسم

اپنے سب سے چھوٹے

سب سے پیارے

بیٹے

سُلطان التمش

کے نام

اورسیز بک سینٹر

پلاٹ نمبر ۵۴ - ۱ - نارتھ لنکن روڈ جوہو ولے پارلے اسکیم

بمبئی ۵۸ فون :- ۵۷۸۲۶۳

www.taemeernews.com

فہرست

۱۔ کالی بلّی ۔ ۹

۲۔ چھپی ہوئی دولت ۱۴

۳۔ وہ کون تھا ۲۰

۴۔ نیا نوکر ۲۶

۵۔ بند دروازے ۳۷

۶۔ امن کانفرنس ۴۹

۷۔ الزام ۵۵

۸۔ سزائیں ۶۰

۹۔ پچھتاوا ۶۷

۱۰۔ آسمان کے رنگ ۷۵

۱۱۔ تعارف ۸۰

۱۲۔ فرمائشی پروگرام ۹۰

۱۳۔ بھائی جان اور دھوبن ۱۰۱

۱۴۔ ماں ۱۱۰

۱۵۔ ہمارے چچا ۱۱۵

۱۶۔ چچا اور ٹیلیفون ۱۲۵

۱۷۔ تصویر ۱۳۱

۱۸۔ پھولوں کا بادشاہ ۱۳۷

۱۹۔ اگر میں سائنسدان ہوتا ۱۴۳

۲۰۔ آرائش ۱۴۶

۲۱۔ مسٹر توڑ پھوڑ ۱۵۶

۲۲۔ بلبل ہزارداستان ۱۶۲

۲۳۔ ماہر باورچن ۱۷۰

۲۴۔ پاگل ۱۷۷

۲۵۔ نسخے ۱۸۷

www.taemeernews.com

قوسِ خیال

بچو — ؟

میرے ہاتھ میں قلم ہے۔ اور مجھے اس کی اہمیت کا احساس ہے — ! اللہ تعالیٰ نے جب دنیا تخلیق کی تو سب سے پہلے قلم بنایا۔ اس پہلے لمحے سے ہی قلم کی اہمیت مسلّم ہے، اور یہ قلم جب کتابیں تخلیق کرتا ہے تو کچھ اور ہی سوا ہو جاتا ہے۔ کتابیں جو بڑی بڑی سلطنتوں کے تاجوں سے بھی کہیں زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہیں — ! ہر کتاب اپنی جگہ اہم ہوتی ہے۔ لیکن وہ کتاب جو بچّوں کے معصوم اور ناپختہ ذہنوں کے لئے لکھی گئی ہو، اس کی اہمیت ہی اور ہوتی ہے — کیونکہ ایک ذہن جو کچّا ہوتا ہے، غلط سلط کتاب پڑھ کر ٹیڑھے راستے بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس لئے میری رائے میں بچوں پر لکھی کتاب کو ہر لحاظ سے مثالی ہونا چاہیے ان کتابوں کو نہ تو نصیحت آمیز باتوں سے خشک اور بور کیا جائے نہ ان میں نعرہ بازی بھر دی جائے۔ نہ تو کہانیاں اتنی غمگین

www.taemeernews.com

ہی ہوں کہ پھولوں کی طرح کھلتے ہوئے ذہن غم کی مار سے بوجھل ہو جائیں — بچّوں میں بھی کبھی ننھی سی بچّی تھی اور جس قسم کی کہانیاں پڑھنا پسند کرتی تھی شاید قدرت نے میرے قلم سے ویسی ہی کہانیاں لکھوائیں —

اب میں بچّی نہیں — خود ننھے منّے بچوں کی ماں ہوں لیکن بچوں کے لیے لکھی گئی کوئی بھی کہانی پڑھتے وقت میرا ذہن ایک بچّی ہی کا سا بن جاتا ہے۔ اور اتنے سال گزرنے پر اب بھی مجھے یہی احساس ہوتا ہے کہ بچوں کے لئے لکھتے وقت بوڑھا بن کر لکھنا ہی زیادہ مناسب ہوتا ہے

کیونکہ آپ بچپن گزار چکے ہوتے ہیں اور اس معصوم زمانے کے بیتے ہر ہر لمحے پر آپ کی گرفت پختہ تر ہوتی ہے۔ آپ اپنے تجربات دوسروں کو بخش کے زیادہ فراخ دلی اور ساتھ ہی ایمان داری کا بھی ثبوت دیتے ہیں — نانیوں دادیوں سے کہانی سننے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ ؟ بات اُسی بڑھاپے کی ٹھہری نا — ؟

یہ میری لکھی ہوئی کہانیاں بیس سال کے عرصے پر محیط ہیں — ان میں بچپن کی شرارتیں بھی ہیں، حوصلے بھی — ولولے بھی — کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی، اور ضدیں بھی - میرا بچپن جن

www.taemeernews.com

کربناک حالات سے گزرا ہے اس کی روداد میں اپنی اولین کتاب "شہر ممنوع" میں "میری کہانی" کے نام سے لکھ چکی ہوں لوگ حیرت کرتے ہیں کہ ایسے غمگین افسانے لکھنے والی بچوں کے لئے ایسے ہنستے کھیلتے مضامین اور کہانیاں کیسے لکھ سکی، بات ہر پھر کر وہی آتی ہے کہ بچوں کے لئے لکھتے وقت بوڑھا بن کر لکھنا زیادہ مناسب ہوتا ہے اور میں تو ٹھہری سدا کی بوڑھی ـــ میرا بچپن غموں کی گود میں پلا بڑھا - ہر ہر قدم پر غم - غم ہی غم - تم سوچو - جس بچی کی ماں اسے ایک سال کی چھوڑ کر مر جائے اور باپ بھی دو سال کی عمر میں چھوڑ کر چل بسے اس کی زندگی میں کون سی خوشی ہوگی؟ الجبرا کا فارمولا ہے minus مائنس، پکس ہو جاتے ہیں - یہ بچوں والی ہنستی کھیلتی کہانیاں اسی فارمولے کی دین ہیں۔ ویسے ان میں کچھ کہانیاں سنجیدہ بھی ہیں۔

میری "بڑی" کہانیوں کی طرح یہ "چھوٹی" بچوں والی کہانیاں بھی اکثر بالکل سچے واقعات پر مبنی ہیں کیونکہ بہرحال میرا عقیدہ یہی ہے کہ زندگی کے سچے حادثات اور حقیقی واقعات سے ہی خوبصورت کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

ان میں سے کچھ کہانیاں میں نے اس وقت لکھیں جب میں

www.taemeernews.com

بالکل چھوٹی سی تھی۔ کچھ کہانیوں نے مجھے ذرا بڑا پایا اور اب میں ان کہانیوں کو بڑا پا رہی ہوں کہ وہ تمہارے اور میرے بیچ محبت، یگانگت اور دوستی کا واسطہ بن گئی ہیں۔

میں تمہیں یہ مجموعہ "بند دروازے" دیتے ہوئے ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں — نام پر مت جاؤ — دروازے تو دراصل اب کھل رہے ہیں۔

پیار سے

واجدہ

واجدہ تبسم

بمبئی

1-1-1979

www.taemeernews.com

کالی بلّی

ایک ننھی لڑکی ۔۔۔ اُس کا نام تھا...... بھائی نام جان کر کیا کروگے؟
اور پھر شیکسپئر نے بھی تو کہا ہے نا کہ " نام میں کیا دھرا ہے ۔۔؟" تو بس نام کے بجائے اس کا کام دیکھو۔

وہ لڑکی جس کا میں نے ابھی اوپر ذکر کیا ہے، صرف نو سال کی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح شرارتی نہیں تھی ۔۔ چپ چاپ سی، غریب سی، اپنی کلاس میں سب سے ذہین لڑکی جس کا رنگ سانولا تھا۔ اس لئے کلاس کی ساری لڑکیاں اُسے "کالی بلّی" کہہ کر چڑایا کرتی تھیں!

وہ لڑکی ان دنوں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ٹیچر کبھی اس سے ناراض ہو جائیں۔ اس لئے ہر کام پہلے ہی کر لیا کرتی۔ مگر یہ تو تم سب ہی جانتے ہو کہ صحبت انسان کو بگاڑتی بھی ہے اور سنوارتی بھی ہے ۔۔ تو جناب ایک دن یہ ہوا کہ کلاس کی ساری لڑکیوں نے پروگرام بنایا کہ آج اسکول کے کام کو چھٹی دے دی جائے اور اودھم مچایا جائے ۔۔ کالی بلّی آخر ایسی کون سی فرشتہ تھی۔ لڑکیوں کے بہکانے میں آگئی ۔۔ اس دن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بھرے باغ میں خزاں پھیر لگا گئی ہے ۔۔ ہوا یہ کہ لڑکیوں نے سارے باغ، باغیچے، کیاریوں

www.taemeernews.com

کی وہ گت بنا کی کہ پوچھو نہیں ــــ اسی پر بس نہیں بلکہ باغ کے مالی کے کتے کو پتھروں، اینٹوں سے خوب مارا ــــ مالن کی پالتو بلی کی دم پکڑ کر گھسیٹ لی ــ گلاب کے پھولوں کے ہار گوندھ کر گدھے کے گلے میں پہنا دیئے ــــ اور باغ کے بیچ میں جو جام کا ہرا بھرا جھاڑ تھا نا، اس پر چڑھ کر سارے جام تباہ کر ڈالے ــــ کچھ کھائے کچھ پھینکے اور باقیوں کا نشانہ باندھا ــــ اور نشانہ باندھا بھی کس پر؟ جو بھی سامنے سے گزر جائے اس پر ــــ چاہے وہ اُردو پڑھانے والی زاہدہ باجی ہوتیں یا انگلش گرامر سمجھانے والی بدمزاج مس نائک، اور دوسری لڑکیوں کو تو کوئی ادھیر تھا ہی نہیں مگر بلی اپنے آپ سہمی جا رہی تھی۔

"ہائے اللہ اب کیا ہوگا ــــ"

مگر اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کرنے کو خالی نہ تھا ــــ انجام سے بے خبر سب اچھل کود میں مصروف تھیں اور بلی کا دل تو رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر سلمیٰ سے پوچھا بھی۔

"آخر اس سارے اودھم اور شرارت کی وجہ کیا ہے؟"

سلمیٰ کچے امرود کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہوئے بولی۔

آخر ہمارے بھی دل ہے کہ نہیں ــــ کل باجی جان نے ایک سرے سے سب ہی لڑکیوں کے کس بے مروتی سے کان کھینچے ــــ ہم نے بھی اودھم مچا کر دل کی جلن مٹا ڈالی۔"

بلی نے کہنا چاہا کہ بھئی قصور تو تمہارا ہی تھا، پھر فارسی یاد کیوں نہیں کی تھی؟ مگر وہ کہہ نہ سکی ــــ کلاس میں سب سے چھوٹی تھی نا؟ اس لئے سب ہی سے ڈرتی تھی ــــ

چپ رہ گئی۔ اور یہ بات تو واقعی ٹھیک بھی تھی کہ فارسی پڑھانے والی باجی جان بے حد تیز مزاج اور غصیلی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈھنگ کر رکھ دیا کرتیں — بلّی جانتی تھی کہ کل سب ہی کی خیر نہیں ہے — اب تو سچ مچ ہی قصور کر دیا تھا — اُف توبہ — مگر لڑکیاں کس قدر شرارتی تھیں اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالا۔ دراصل وہ باجی جان تھیں نا؟ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ صدا اپنے چہرے کو کتاب کی اوٹ میں رکھا کرتیں — شرارت کی جڑ عذرا نے سوچ لیا۔ ارے باجی جان کو تھاپ دینا کون بڑی بات ہے؟ وہ بھلا کب آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہیں، بس ڈیسکوں کے اندر کتابیں کھول کر رکھ لیں گے اور جو وہ پوچھتی جائیں گی، جواب دیتے جائیں گے۔ آخر سمجھتی کیا ہیں اپنے آپ کو —"

دوسرے دن گھنٹی بجی اور فارسی کا پریڈ آیا تو سب لڑکیاں سوچے سمجھے پروگرام کے مطابق کتابیں کھول کر بیٹھ گئیں۔ بلّی کے ساتھ یہ مصیبت تھی کہ سب سے اگلی بنچ پر بیٹھتی تھی۔ مگر کرتی کیا؟ اب یہ مشکل آن پڑی کہ باجی جان نے بجائے آگے پڑھانے کے، پیچھے کا سبق پوچھنا شروع کر دیا — اب اتنا سارا پچھلا سبق کسے یاد تھا؟ مگر مصیبت سر پر کھڑی تھی تو بھگتنا ہی تھا — کتابوں کے صفحے کھڑکھڑائے اور سب مستعد ہو گئیں — باجی جان ہمیشہ آخری سرے سے سبق پوچھنا شروع کرتی تھیں، اس طرح سب سے پہلے بیٹھنے والیوں کی باری سب سے بعد کو آتی تھی — پیچھے بیٹھنے والیوں کی تو عید تھی۔ مزے سے سارا سبق سنا دیا — اگر باجی جان کتاب چہرے سے ہٹا ہی دیتیں تو —؟ کس قدر

رسوائی کی بات تھی ــــ؟ پھر بھی ہمت کرکے بلّی نے کتاب کھولی اور باجی جان کے سوال میں کہہ اٹھی ــــ

"این طفل زیرک است"

بلّی سب سے چھوٹی تھی اس لئے سب ہی اُستانیوں کی منظورِ نظر تھی، مگر باجی جان تو اس قدر غصیلی تھیں کہ اُسے کوئی لفٹ ہی نہ دیتیں ــــ لیکن پتہ نہیں آج کیا ہوا کہ وہ بھی خوش ہو اٹھیں ــــ

"واہ بھئی واہ ــــ کمال کر دیا ــــ اتنا پچھلا سبق اور کس قدر فر فر یاد ہے۔"

بلّی کی ناک پر مارے ندامت کے پسینہ آگیا!

"اُف باجی جان نے آج تک تعریف نہ کی تھی، اور کی تو اس لفاظی سے سُنائے گئے سبق پر" ــــ اور اس فارسی کے جملے کے کیا معنی تھے معلوم ہے تمھیں ــــ "یہ بچّہ بڑا ذہین ہے" ــــ ہونہہ تُف ہے ایسی ذہانت پر ــــ یہ تو بڑا چھوٹا پن ہے ــــ دھوکا ہے ــــ وہ دھیرے سے اپنے دُبلے پتلے جسم کو سنبھالے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی ــــ

"مگر یہ تو میں کتاب میں سے پڑھ کر سنا رہی تھی ــــ!!" ساری کلاس میں کھلبلی مچ گئی اور خود باجی جان کتاب پھینک کر انگارہ بن گئیں ــــ

"تم نے ایسا کیوں کیا ــــ؟" وہ گرج رہی تھیں۔ بلّی بڑی سادگی اور بھولپن سے بولی۔ "اس لئے کہ میں آپ کی مار نہیں کھانا چاہتی تھی ــــ" اور اب اس دھوکا دہی پر تو ماروں گی ــــ تب ــــ!"

وہ اپنی آنکھیں جھپک کر بولی "لیکن میرے دل پر گناہ کا بوجھ تو نہیں رہے گا کہ میں نے اپنی استانی کو دھوکا دیا۔" اور پھر تم جانتے ہو کیا ہوا۔؟ وہ ایک دم مہربان اور شفیق دیوی جیسی نظر آنے لگیں۔ دھیرے دھیرے چلتی وہ بلّی کے ڈیسک تک پہنچیں اور پیار سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" (ہماری کلاس میں اتنی ساری لڑکیاں تھیں کہ ٹیچرز کو نام بھی یاد نہ رہتے)۔ بلّی ذرا جھینپ کر بولی۔ "جی کلاس کی لڑکیاں تو مجھے کالی بلّی کہتی ہیں۔ ویسے ابّو نے میرا نام واجدہ رکھا تھا ــــ"

باجی جان لڑکیوں پر گرج پڑیں۔ "ارے کالی تو یہ ہیں ــ ان کے دل کالے ہیں ــ تم تو سب سے ہونہار ہو، پیاری ہو، نیک ہو، سچّی ہو، خدا تم پر مہربان ہے ــ تم اپنی سچّائی کی بدولت چاند بن کر چمکو گی ــ حالانکہ سب سے چھوٹی ہو، مگر آج سے کلاس کی مانیٹر تم ہو گی ــ سمجھ گئیں نا؟"

میرا چہرہ مسکرانے لگا ــ وہ مسکراہٹ اتنی وسیع ہو گئی کہ ساری زندگی پر چھا گئی اور آج بھی وہ تبسم میرے نام کا حصّہ بنا، میری زندگی کے ساتھ ہی رہتا ہے!

چھپی ہوئی دولت

بچّے بڑی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ سب ہی بچّے ایسے ہوتے ہیں، لیکن میرے بچّے کچھ زیادہ ہی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ میرے سارے بچّے بارہ تیرہ سال کی عمر کے اندر ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن کی اس عمر کے بچّوں سے ذرا بھی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ مذہب کے متعلق، اللہ میاں کے متعلق، غریبی امیری کے متعلق ــــــ

مثلاً ایک دن میرے صاحب زادے ٹیپو سلطان بہت ہی فکر مند ہو کر پوچھنے لگے۔ "ممّی، بے چارے اللہ میاں کا دل کیسے لگتا ہوگا؟"

میں نے نہایت حیرت سے سوچا ــــ یا اللہ، یہ اللہ میاں "بے چارے" کب سے ہو گئے؟ پھر بھی میں نے مارے تجسّس کے پوچھ ہی لیا۔ "لیکن بات کیا ہو گئی؟"

کہنے لگے "یہی کہ اللہ میاں کی نہ بیوی ہیں نہ بچّے۔ پھر آسمان پر اُن کا دل اکیلے میں کیسے لگتا ہوگا؟"

مجھے یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ مذہب کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں، ہاں تھوڑا بہت ضرور جانتی ہوں اور جب بھی بچّوں نے اس قسم کا

سوال کیا ہے کہ "ممّی دنیا کو اور ہم سب کو اللہ میاں نے پیدا کیا ہے، لیکن خود اللہ میاں کو کس نے پیدا کیا؟" تو میں نے اپنے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق یہی جواب دے کر انھیں سمجھایا کہ "خدا نے ہر چیز پیدا کی، لیکن خود اُسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ـــــ اور جب بھی ذہن میں ایسا خیال آئے فوراً لا حول پڑھ دیا کرو، کیونکہ ایسے وسوسے شیطان کی دین ہوتے ہیں ـــــ" لیکن جب بچّے اللہ میاں کی "بے چارگی" کے بارے میں سوال کرنے لگیں تو میں انھیں ڈانٹتے اور خود خدا سے معافی مانگنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی کہ "مالک یہ بچّے ہیں۔ اگر نادانی سے ایسا سوال کر بھی دیا تو تُو انھیں بھی معاف کر دے اور مجھے بھی۔" لیکن جب سوال دولت کی نابرابر تقسیم یعنی امیری اور غریبی کا آجاتا ہے اور بچّے پوچھتے ہیں: "ممّی دنیا میں کچھ لوگ بے حد امیر اور کچھ لوگ بے حد غریب کیوں ہیں؟ شاید بے چارے اللہ میاں کی چلتی نہیں کچھ ـــــ ورنہ اللہ میاں ضرور امیروں سے پیسہ لے کر غریبوں کو دے دیتے۔" تو میں جان بوجھ کر خاموش رہ جاتی ہوں۔ اتنے اتنے بچّوں کو دولت کی غلط تقسیم کا حساب کیسے سمجھاؤں؟ کیا اللہ میاں نے ایسے قانون نہیں بنائے کہ دولت برابر برابر بٹتی رہے ـــــ آمدنی کا چالیسواں حصّہ غریبوں کے لئے وقف کرنا، زراعت میں کھیتی کی پیداوار کا ایک حصّہ نکال دینا، قربانی میں تیسرا حصّہ

عید میں فطرہ ، کتنی ہی باتیں ہیں۔ لیکن بچّے تو بہت ہی چھوٹے ہیں۔ اس لئے میں ان سے کہہ دیتی ہوں کہ " بچّو ، امیر لوگ اپنی دولت چُھپا چُھپا کر رکھ دیتے ہیں جو مذہب کی رُو سے گناہ ہے اور حکومت کی نظر میں جرم ۔ اگر سب امیر لوگ اپنی ضرورت بھر کا روپیہ خود رکھ کر باقی غریبوں کو دے دیں یا خود حکومت کو واپس کر دیں تو دنیا میں اور خاص طور سے ہمارے ہندوستان میں اتنی غریبی نہ رہے ۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے ، ایک غریب سی عورت گود میں ایک بیمار اور مریل سا بچّہ سنبھالے ، بھیک مانگتی آئی ۔ شدید سردی پڑ رہی تھی ۔ مجھے اس عورت پر بڑا رحم آیا۔ میں نے اپنی ایک ساڑی اور اپنے چھوٹے بیٹے التمش کی ایک شرٹ اسے دے دی اور اپنے کام میں لگ گئی ۔ تھوڑی دیر بعد گیلری میں آئی تو دیکھا کہ وہی عورت کپڑوں کی ایک اچھی خاصی پوٹلی سنبھالے جا رہی ہے ۔ سراج الدولہ ، چاند بی بی اور غازی صلاح الدین نے مجھے بتایا ۔" ممّی وہ بے چاری عورت کہہ رہی تھی کہ اس کے اور بھی کئی بچّے ہیں ، اس لئے ہم سب نے اپنا اپنا ایک ایک جوڑا اُسے دے دیا "

میں نے بچّوں سے کہا ۔" بچّو ، اگر سب لوگ اِسی طرح غریبوں کی مدد کریں اور اپنی دولت اور اپنے کپڑے اس طرح چھپا کر نہ رکھیں تو کتنے ہی غریبوں کا بھلا ہو جائے ۔"

شام کو سب ٹی۔ وی دیکھنے بیٹھے ــــ حکومت کی طرف سے ایک اشتہار دکھلایا گیا جو چھُپی ہوئی دولت کے بارے میں تھا۔ بچوّں نے ایک دم چونک کر اور چلّا کر مجھ سے کہا۔

"ارے ممّی حکومت بھی تو وہی کہتی ہے جو آپ کہتی ہیں ــــ"

"ہاں بچّو، میں بھی وہی کہتی ہوں جو حکومت کہتی ہے۔ لیکن لوگ مانیں تب نا۔ ہم لوگ سڑک سے گذرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہماری ہی طرح کتنے لوگ جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ شدید سردی شدید گرمی جھیلتے ہیں، فاقے کرتے ہیں، ننگے رہتے ہیں۔ بیماریاں سہتے ہیں۔ انسان کی انسان سے یہ بے حسی! کیا وہ بھی ہماری طرح دنیا کی ہر نعمت کے حق دار نہیں؟ اگر چھُپی ہوئی دولت اور کالا دھن جائز ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کیا دُنیا جنّت نہیں بن سکتی؟"

معصوم اور ننھے منّے بچّوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میرے بچّے حسّاس دلوں کے مالک ہیں ــــ

میرے ایک ماموں جان پولیس میں آفیسر ہیں۔ اپنی مصروفیات کے مارے وہ بہت کم آپاتے ہیں، مگر جب بھی آتے ہیں، سارے بچّے انھیں گھیر لیتے ہیں۔ اور میری ہی طرح "ماموں جان، ماموں جان" کرنے لگتے ہیں۔

اُس دن ــــ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے ــــ ماموں جان آئے۔ کھانے وانے کے بعد وہ چلنے لگے تو میری دس سال کی بچی چاندنی بی اپنی

ایک چھوٹی سی تھیلی لے کر آئی اور شرماتے شرماتے اُس نے وہ تھیلی ماموں جان کے ہاتھ میں دے دی۔

"یہ کیا ہے، بی بی؟" ماموں جان خوش دلی سے بولے۔ وہ ایک عجیب سی درد کبھری خوشی کے ساتھ کہنے لگی "ممّی، مجھے روزانہ اسکول میں ریسس میں کھانے کے لئے پیسے دیتی ہیں نا — وہ میں جمع کرتی رہتی تھی۔ چھپا چھپا کر رکھتی تھی کہ چھوٹی سی گڑیا خریدوں گی — وہی جو چابی سے چلتی ہے اور ڈانس کرتی ہے نا ماموں جان، وہ — لیکن ممّی کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنی چھپی ہوئی دولت حکومت کو دے دیں تو غریب امیر ہو سکتے ہیں — ماموں جان اتنے روپوں میں کسی غریب کے لئے ایک کمبل تو آ جائے گا نا؟"

گیارہ روپے چودہ پیسے کی رقم ماموں جان کے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی، لرز رہی تھی۔

"میری بچی —" میں نے اپنے آنسوؤں کو روک کر کہنا چاہا۔ "مہنگائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ گیارہ روپے کی حقیر رقم میں نہ ایک کمبل آ سکتا ہے، نہ ایک ساڑی، نہ کسی غریب ٹھٹھرتے ہوئے بچے کے لئے ایک سوئٹر بھی لیکن تیرا یہ بیش بہا جذبہ اُس دیوار کو ضرور ڈھا سکتا ہے جو امیروں اور غریبوں کے بیچ میں ناقابلِ عبور چٹان بن کر کھڑی ہوئی ہے۔"

ماموں جان نے چاند بی بی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پولیس آفیسر بڑے سخت دل ہوتے ہیں، لیکن میں نے ماموں جان کی آنکھوں میں جھلمل جھلمل آنسو دیکھے جنہیں پینے کی وہ ناکام سی کوشش کر رہے تھے۔

"نہیں ماموں جان۔ ان آنسوؤں کو پینے کی کوشش نہ کیجئے۔ ان میں جو پیغام چھپا ہے اُسے ہمارے ہندوستان کو پڑھ لینے دیجئے۔"

وہ کون تھا؟

جب ابّو کا جنازہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے اچانک کسی کمی کا احساس کیا ــــ کیونکہ قسمت سے امّی بھی دو سال پہلے ہی خدا کو پیاری ہو چکی تھیں۔ میں نے بڑے سوچ بھرے انداز میں بابا سے سوال کیا۔ "بابا اب میرے لئے گڑیا کون لایا کرے گا؟"

بابا جو ہتھیلی پر تمباکو مل رہے تھے میرے اس سوال پر دہل سے گئے۔ بہت دیر کے سوچ بچار کے بعد انھوں نے جواب دیا تھا۔

"اوپر والا بھیجے گا۔"

یہ کئی برس پہلے کی بات ہے ــــ اُن دِنوں میں بالکل ننھّی سی بچّی تھی اور دو سال کی مختصر سی مدّت میں امّی اور ابّو دونوں اللہ میاں کے پاس جا چکے تھے۔ گھر میں ہم چھوٹے چھوٹے بہنوں بھائیوں کا واحد آسرا بوڑھی، بے کس، بیوہ نانی اماں تھیں ــــ اور گھر سے باہر بابا۔ (خدا تو بہرحال تھا ہی)

بابا ہمارے بڑے سے ڈھنڈار گھر کی رکھوالی اور دربانی کرتے تھے۔ دن بھر تمباکو کھاتے یا پیتے۔ ہتھیلی پر مل کر کھاتے،

حقّے میں بھر کر پیتے ــــ نانی امّاں پردے کی آڑ سے جب بھی کھانے کا تھال (ڈیوڑھی) مردانے میں سرکاتیں، تمباکو کا بھپارہ ان کا استقبال کرتا۔ وہ محبت، ڈانٹ اور غصّے بھرے لہجے میں کہتیں "دیکھ لینا' تمباکو پی پی کر یہ شخص ایک دن اپنی جان دے دے گا۔"

بابا کی تنخواہ دو روپے ماہانہ تھی ـــــ اور اس زمانے کے دو روپے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انڈا دو پیسے کا ایک ملتا تھا۔ بکرے کا گوشت آٹھ آنے سیر تھا۔ ایک پیسے میں چار سودے مزے سے آتے تھے۔ ایک پیسے میں شکر، چائے کی پتّی، دودھ گڑ ایک ساتھ آسکتا تھا۔ ایک روپیہ پانے والا مالامال رہتا تھا ـــ اور بابا کو تو دو روپے ملتے تھے۔ اور وہ دو روپے، پورے کے پورے تمباکو کی بھینٹ چڑھتے تھے، جبکہ تمباکو آج مہنگائی کے اس دور میں بھی اتنا سستا ملتا ہے!

لیکن بابا کسی کی نہ سنتے۔ دن رات کا ایک ہی شغل تھا ـــ تمباکو ـــ تمباکو ـــ تمباکو۔ وہ تمباکو کے ایسے دستی تھے کہ خوشی میں، غم میں، دکھ میں، بیماری میں کبھی تمباکو کھانا نہ بھولتے ـــ اتّو کا جنازہ جا رہا تھا۔ نانی امّاں پچھاڑیں کھا کھا کر رو رہی تھیں۔ پاس پڑوس والے، شہر والے سسک رہے تھے ـــ اور بابا، اگرچہ آنکھوں میں اُن کی بھی آنسو تھے، لیکن تمباکو کا شغل بہرحال جاری تھا۔

بابا ہم بچّوں سے عجیب طرح کی محبّت کرتے تھے ۔ عجیب طرح کی اِن معنوں میں کہ بظاہر بہت ڈانٹتے ڈپٹتے لیکن صاف لگتا کہ اس ڈانٹ کی تہہ میں محبّت ہی محبت ہے۔ (یہ سب کچھ تو میں اب سوچتی ہوں!) ایک گہرے اور وسیع سمندر کی طرح ان کا وجود سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے لگتا۔ بابا مجھ سے خاص طور پر بڑی شفقت سے پیش آتے ۔ دوسری بہنوں بھائیوں کی طرح میں ان سے ڈرتی بھی نہیں تھی ۔ نہ ان کی سفید داڑھی سے، نہ بڑی بڑی مونچھوں سے۔ بس تکلیف صرف ایک ہی تھی اور میں بارہا اُن سے اس تکلیف کا اظہار کر چکی تھی۔

"بابا تمہارے پاس بیٹھو تو تمباکو کی بہت بدبو آتی ہے۔ تم تمباکو کھانا پینا چھوڑ دو نا بابا!"

وہ سر ہلا کر کہتے۔" نا بی بی ۔ ہم چاہیں تو اس زندگی کو ہی چھوڑ دیں۔ مگر تمباکو ہم سے نہیں چھوٹ سکتا ۔ ہاں۔"

ابّو کے انتقال کے بعد ایک عید ایسی آئی کہ ہمارے لئے نئے کپڑے بھی نہیں بنے، کھلونے بھی ہمیں نہیں ملے، اچھے اچھے پکوان بھی نہیں پکے۔ میری اسکول کی ایک سہیلی نے بڑے فخر سے لال لال گوٹا ٹکے کپڑے پہنے تھے اور ساری سہیلیوں کو سنایا تھا کہ ویسے تو وہ خود بھی بہت پیسے والے لوگ ہیں، لیکن وطن سے ہر سال ان کے ہاں عید کے عید پوسٹ مین منی آرڈر لیکر

آتا ہے۔ کبھی چچا کا، کبھی دادا کا۔"

"بابا یہ منی آرڈر کیا ہوتا ہے؟" میں نے بابا سے بڑے تعجب پوچھا تھا۔ اور جب بابا نے مجھے منی آرڈر کے معنی سمجھائے تو میں نے ٹوٹے دل سے، بھری آنکھوں سے بابا سے پوچھا۔" بابا میرے نام منی آرڈر کیوں نہیں آتا؟"

بابا نے تمباکو کی ڈبیا کو (جسے وہ اپنی زندگی کہتے تھے) سامنے سے ہٹا کر کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔" آئے گا بیٹی ــــ ضرور آئے گا۔ بھیجنے والے کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں۔ اور عید ہی کی کیا بات ہے بیٹی ہر مہینے آئیگا"

نانی اماں اب کبھی مردانے سے گذرتیں تو حقے اور تمباکو کی مخصوص خوشبو ان کا استقبال نہ کرتی۔ بابا کی جماہیوں کی آواز سارے میں گونجتی رہتی۔ راتوں کو جاگنے والے بابا، دن کو بھی اونگھتے رہتے۔ اوپر کے کام والے چھوکرے نے نانی اماں کو خوشخبری سنائی۔" بی بی اماں ــــ بڑے میاں نے تمباکو چھوڑ دیا شاید! دن بھر جماہیاں لیتے اور اونگھتے رہتے ہیں۔"

نانی اماں کو بھلا ایسی ان ہونی بات پر کیسے یقین آجاتا۔

اگلے مہینہ کی پہلی کو جب پردے کی آڑ سے نانی اماں نے تنخواہ کے دو روپے بابا کے سامنے رکھے تو ساتھ ہی یہ بھی پوچھا۔" رمضان خاں میں نے سنا ہے کہ تم نے تمباکو پینا چھوڑ دیا؟"

بابا ہنس دیئے ــــ ایسی ہنسی جو "ہاں" کہلائی جا سکتی تھی۔

تین دن بعد پوسٹ مین نے دروازے پر آواز دی — میرے نام منی آرڈر آیا تھا!

سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ نانی اماں تو پڑھی لکھی تھیں نہیں۔ بڑے بھیا اسکول کا دیا ہوم ورک کرنے بیٹھے تھے۔ بلائے گئے۔ کوپن پر بھیجنے والے نے لکھا تھا۔ "بچی کے سامنے اس کا نام نہ لیا جائے ویسے پتے سے معلوم ہو ہی جائیگا کہ کس نے بھجوایا ہے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ بچی اپنے ہم عمروں کے سامنے کسی احساس کمتری کا شکار بنے کہ منی آرڈر آیا تو کہاں سے؟"

بڑے بھیا نے بھیجنے والے کا نام نہیں لیا۔ اتنا کہہ دیا کہ اسی شہر سے آیا ہے۔ کسی دوسرے محلے سے! کوپن میں یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ "میری چھوٹی سی خواہش ہے کہ ننھی بچی کو اس روپے سے گڑیاں دلادی جائیں اور ہمیشہ اسی طرح گڑیاں دلادی جایا کریں۔"

اب میں سارے سارے دن ڈیوڑھی میں بابا کے پاس اپنی ڈھیر ساری گڑیاں لئے بیٹھی کھیلتی رہتی۔ کیونکہ اب بابا کے پاس تمباکو کی بدبو نہ ہوتی۔ میں اتنی ساری گڑیاں دیکھ کر رہ رہ کر خوشی سے کھلکھلا اٹھتی، ہر مہینے ان گڑیوں کی گنتی بڑھتی ہی جاتی۔ میں بابا سے خوش ہو کر کہتی۔ "بابا تم نے سچ کہا تھا کہ ابو مر گئے تو کیا ہوا۔ اوپر والا گڑیاں بھیجا کرے گا۔"

پھر ایک دن بابا چلے گئے ـــــ ایسی جگہ جہاں سے پھر کوئی پلٹ کر واپس نہیں آتا۔ اس سے اگلے مہینے پوسٹ مین میرے لئے کوئی منی آرڈر نہیں لایا۔ اور پھر میں، جو اُن دنوں چھٹی جماعت کی ایک سمجھ دار طالبہ تھی سب کچھ سمجھ گئی۔

میں سمجھ گئی کہ گڑیا دلانے والا، منی آرڈر بھیجنے والا وہ کون تھا۔

وہ اوپر والا تو نہیں تھا ـــــ خدا تو نہیں تھا۔ لیکن خدا ہی کا ایک روپ تھا ـــــ کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ محبّت کرنے والے انسان اپنے خدا کا ہی ایک روپ ہوتے ہیں۔ وہ خدا نہیں ہوتے، لیکن خدا کے نیک اور جنتی بندے ضرور ہوتے ہیں۔

نیا نوکر

بمبئی اپنی تعریف قطعاً مقصود نہیں لیکن حقیقت کا اظہار کئے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ہمارے یہاں نوکروں سے نہ صرف یہ کہ برابری کا، بلکہ بڑائی کا سلوک کیا جاتا ہے ـــ برابری کا سلوک اسے کہتے ہیں کہ آپ کرسی پر بیٹھیں تو نوکر بھی کرسی پر بیٹھے آپ اگر بریانی قورمہ کھائیں تو نوکر بھی بریانی اور قورمہ کھائے۔ لیکن ہمارے یہاں نوکروں سے بڑائی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کبھی آپ کو ہمارے ہاں آنے کا اتفاق ہوا ہوگا تو آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ہم سب نیچے بیٹھے ہیں اور صوفے پر جو صاحب بیٹھے ہیں وہ ہمارے باورچی صاحب بیٹھے ہیں۔ مہنگائی اور بلیک مارکیٹ کے اس دور میں ہم گرڈ کی چائے پی رہے ہیں اور ہمارے نوکر صاحبان شکر کی۔ اس لئے کہ گرڈ گرم ہوتا ہے اور گرم چیز کے استعمال سے انھیں پیچش ہو جاتی ہے۔ ہم سبزی ترکاری پر کبھی کبھار گذارہ کرلیں لیکن ہمارے نوکر کباب اور انڈے کھائیں گے ـــ ایک حقیقت کی طرف آپ کا دھیان دلادیں کہ اب ہم اتنے "اچھے مالک" بھی نہیں ہیں کہ واقعی نوکروں سے انسانوں کا سا سلوک کریں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ آج کل کے اس کمبخت دور میں

نوکر ملتے ہی کہاں ہیں ــــ؟ اسی لئے ہر ہر طرح اُن کی ناز برداریاں کی جاتی ہیں کہ ذرا ٹک کر رہیں۔ لیکن افسوس اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی کوئی نوکر مہینے دو مہینے سے زیادہ نہیں رہا ــــ ہوتا یہ ہے کہ نئے آنے والے نوکر کو کوئی نہ کوئی یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ پچھلا نوکر کو تو یہ یہ آسانیاں میسّر تھیں" وہ صاحب کا سگار بھی پیتا تھا" مہمانوں کے لئے ٹوسٹ پر مکھن چیلی لگا کر بعد میں لے جاتا تھا پہلے اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ فرج کے پانی کے سوا اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ اور تم ہو کہ کورے مٹکے کے پانی میں (وہ بھی جو باورچی خانے کے ایک سڑے ہوئے کونے میں رکھا ہوا ہے) خوش ہو!" ظاہر ہے کہ انسان انسان ہی ہوتا ہے۔ ایسی باتوں سے نیا آنے والا بدک جاتا اور پھر گھر بغیر نوکر کے رہ جاتا۔

ایک دو بار یہ بھی آزما دیکھا کہ بھلا بغیر نوکر کے گذر کیوں نہیں ہو سکتی۔ "امریکہ اور لندن والے بھی تو آخر انسان ہی ہیں وہ کیسے بغیر نوکر کے گزارہ کر لیتے ہیں۔" لیکن اس کے نتائج اتنے بھیانک نکلے کہ پوچھئے مت۔ ــــ ماشاءاللہ بہت بڑی فیملی ہے اور بال بچوں کا ساتھ۔ امریکہ اور لندن والوں نے ہر کام کے لئے نت نئی مشینیں ایجاد کر لی ہیں ہم کہاں سے لائیں ــــ مختصراً اتنا سُن لیجئے کہ دو ہی دن میں بغیر نوکر کے یہ حال ہو گیا کہ برابر کے بنگلوں والوں نے میونسپلٹی میں جا کر اطلاع دے دی کہ فلاں فلاں بنگلے کی وجہ سے شہر میں کالرا پھیلنے کے سخت امکانات ہیں ــــ

احتیاط کے طور پر کالرا کے انجکشن جلد سے جلد لگوا دیئے جائیں۔"

دوسری صبح یہ منظر دیکھا کہ بہت سارے ڈاکٹر اور نرسیں ڈاکٹری کے آلات سنبھالے چلے آرہے ہیں ــــ گھر کے ہر ہر کونے کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ اور پکڑ پکڑ کر ہر ایک کے بازو میں انجکشن گھونپے گئے۔ انجکشن لگے تو سبھوں کو بخار آنا لازمی تھا جس سے صورت حال اور تباہ ہوگئی۔ کیونکہ بچوں کو بیٹھے بٹھائے اسکول سے چھٹی ہوگئی تو سب بچوں نے مِل کر طے کرلیا کہ نوکر انتہائی غیر ضروری شئے ہے، بغیر نوکر کے زندگی زیادہ "سہانی" ہوتی ہے ــــ لیکن ظاہر ہے یہ بچوں کا نظریہ تھا اور بچوں اور بڑوں کے تجربات میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک دن بیٹھ کر صورتِ حال پر سب نے غور کیا اور باقاعدہ میٹنگ کی گئی کہ آخر اپنے یہاں نوکر ٹکتے کیوں نہیں ہیں جب کہ ان سے مالکوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے ــــ؟

بھائی جان جنھیں بہت ساری معلومات رہتی ہیں فکرمندی سے سر ہلا کر بولے۔ "اصل بات یہ ہے کہ چھوٹے لوگوں کو کبھی منہ نہیں لگانا چاہیئے۔ اپنے یہاں کی بڑی غلط ریت ہے کہ نوکر کے آتے ہی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ کوئی بادشاہ آگیا۔ کوئی اس کے لئے دوڑ کر چائے لاتا ہے۔ کوئی پان، کوئی کھانے کے لئے پوچھتا ہے۔ کوئی اپنی پرانی پتلون دے دیتا ہے کہ "پہلی پریشن" اچھا پڑے۔ اس طرح نوکر یہ

سمجھتا ہے کہ اس گھر میں وہ خود نوکر بن کر نہیں آیا بلکہ اسے خود گھر بھر کے نوکر مل گئے ہیں اس لئے صورتِ حال بے حد نازک ہو جاتی ہے ہر نیا نوکر گھر والوں کا نرم رویہ دیکھ کر اپنی زبان کا پہلے تو جائز پھر ناجائز استعمال شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ اب جو بھی نیا نوکر آئے اس کے ساتھ سب سے پہلی شرط یہ ہو کہ وہ اپنی زبان نہ کھولے ـــــ اور اگر کھولنا بھی چاہے تو ہم کھولنے نہ دیں۔"

بھئی اب بھائی جان ایسے ویسے بھی نہیں آخر ایم اے پاس ہیں اور آٹھ سو روپے ماہانہ کماتے ہیں ظاہر ہے ان کی رائے سبھی کو پسند آئی۔ لیکن ارشد میاں بولے۔

"کم سے کم اس کا نام پوچھنے کے لئے تو اس کی زبان کھلوانی ہی پڑے گی نا ـــ؟"

"کوئی ضرورت نہیں۔ ہم "بوائے" کہہ کر بھی کام چلا سکتے ہیں۔ نام سے پکارنا کیا ضرور ہے؟"

جیسا کہ اپنے موقعوں پر ہوتا ہی ہے، تھوڑی دیر بحثم بحثا ہوئی لیکن جیت بھائی جان کی ہی ہوئی۔ ابا جان اور امی جان نے بھی کہا "ٹھیک ہے جیسی جاوید میاں کی مرضی ـــ یہ حقیقت بھی ہے کہ ہمارے ہاں آنے والا ہر نیا نوکر ہم لوگوں کے نرم رویے سے (یا ممکن ہے حماقت سے) بہت زبان دراز ہو جاتا اور کبھی کبھی تو حالات حد سے گذر جاتے۔ جیسا کہ ایک

موقعے پر ہوا تھا کہ ابا میاں کے دوست کے لئے نیا نوکر چائے مع لوازمات کے لے کر گیا۔ لیکن دوست کے سامنے بیٹھ کر (جی ہاں صاحب صوفے پر) پہلے تو ایک کے بعد ایک گیارہ ٹوسٹ جیلی اور مکھن لگے، خود کھائے کسی اور کو دینے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس پر کسی نے جل کر، مگر ذرا نرم آواز سے کہا "بھئی چائے ٹھنڈی ہو جائے گی ـــ چچا میاں کو بھی ایک آدھ ٹوسٹ دے دو۔"

تو وہ بے حد تیزی سے بولا "کیا ان کے گھر میں کھانے کو نہیں جو دوسروں کے ہاں آن موجود ہوتے ہیں؟"

بہرحال ہوا یہ کہ ہمارا پچھلا نوکر بھاگ چکا تھا اس لئے نیا نوکر (یعنی بوائے) آنے والا تھا ـــ سب اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ اس کے ساتھ واقعی نوکروں کا سا (یعنی جیسا کہ دنیا کے عام گھرانوں میں نوکروں کے ساتھ سلوک ہوتا ہے کہ پہلے مالک لوگ کھاتے ہیں پھر نوکر، مالک لوگ گوشت کھاتے ہیں، نوکر دال ـــ مالک شکر کی چائے پیتے ہیں، نوکر گڑ کی، مالک استری کے کپڑے پہنتے ہیں، نوکر سب کی اترن ـــ مالک لوگ سگار پائپ سگریٹ پیتے ہیں اور نوکر سلریٹ کے بچے ٹکڑے) سلوک کیا جائے گا۔

اب کی بار نوکر کا استقبال ابا میاں کے کسی دوست نے کیا۔ نیا نوکر دہلی سے بذریعہ ٹرین بمبئی پہنچنے والا تھا۔ ابا میاں کے دوست نے کہا تھا کہ پلیٹ فارم پر بہت سارے آدمیوں میں تم کیسے پہچان سکو گے کہ یہی وہ

نیا نوکر ہے اس لئے میں اس کے بازو پر ایک سرخ رنگ کی پٹی باندھ دوں گا۔ اس طرح اسے پہچاننے میں آسانی رہے گی۔ اتفاقاً ابّا میاں کو خود کسی کام سے بمبئی سے باہر جانا پڑ گیا۔ اس لئے وہ ہم سبھوں کو جتاتے گئے تھے کہ بمبئی فلاں فلاں تاریخ کو اسٹیشن جا کر نئے نوکر کو ضرور لے آنا۔

خدا خدا کر کے مقررہ تاریخ آئی اور بالکل اس انداز سے، جیسے کہ پولیس کسی قیدی کو سنبھال کر لائے۔ بھائی جان مع دو تین بچّوں کے نئے نوکر کو بغیر ایک بات کئے سیدھے گھر لے آئے، اس نے بولنے کی کوشش بھی کی جس کو ہم سب نے ناکام بنا دیا

نیا نوکر خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا، ویسے تو ہمارے یہاں جتنے بھی باورچی ہوئے ہیں سبھوں کا لباس کوٹ پتلون یا بش شرٹ، شرٹ کے ساتھ پینٹ رہی ہے لیکن ان صاحب کے ساتھ ایک سوٹ کیس بھی تھا۔ اور چہرے پر یعنی کہ آنکھوں پر چشمہ بھی لگا رکھا تھا ـــــ طے شدہ پروگرام کے تحت کسی نے ان سے ایک بات تک نہ کی ـــــ البتہ امّی جان نے انھیں انگلی کے اشارے سے کچن کا رستہ بتایا اور کہا۔

"پہلے منہ ہاتھ دھولو ـــــ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آدمی بنو اور فریج میں سے گوشت ترکاری نکال کر سالن بنانے شروع کر دو۔"

اس پر نوکر نے دیدے پٹ پٹا کر امّی جان کو دیکھا اور بولنے کے لئے ہونٹ کھولنے چاہے مگر یہاں تو پہلے ہی طے تھا کہ اب سے نئے نوکر کو بولنے

نہ دیں گے ۔ اس لئے اس کے ہونٹوں کی مبہم سی پھڑپھڑاہٹ دیکھتے ہی بھائی جان بولے ۔ "زیادہ زبان ہلانے کی ضرورت نہیں ۔ اپنے کام سے کام رکھو ۔ ارشد انھیں باورچی خانے میں پہنچا دو ۔"

نوکر نے بے حد بوکھلا کر اور گڑبڑا کر اپنے کپڑوں کی طرف گونگوں کی طرح اشارہ کیا جس پر بھائی جان تنپک کر بولے ۔ "جی ہاں معلوم ہے آپ بہت لاٹ صاحب ہیں ۔ کوٹ پتلون خراب ہونے کا ڈر تھا تو نوکری کے لئے نکلے ہی کیوں تھے ۔ روزی اور روٹی ایسی شان بگھارنے والوں کو نہیں ملتی ۔ سیدھی طرح جائیے کچن میں ۔"

اب کے نوکر کے گلے سے ایسی آواز نکلی جیسے دنبے کو ذبح کیا جائے ـــ "مگر ـــ م ـــ م ـــ میں ـــ"

امّی جان ڈپٹ کر بولیں ۔ "میں میں کیا کر رہے ہو ـــ سیدھی طرح منہ ہاتھ دھو کر کام شروع کرو ۔"

پُرانے نوکروں کے رویّے سے محتاط ہو کر ہی تو یہ رویّہ اپنایا گیا تھا ۔ ان سے کسی قسم کی توقع رکھنی چاہیئے نہ کرم اور رحم کرنا چاہیئے ۔ اس لئے بھائی جان نے غنڈوں کے سے انداز میں ایک ہاتھ نئے نوکر کی گردن میں دیا اور آگے کو جھکا کر بولے ۔

"روٹی پکانے جاتے ہو کچن میں یا ..... لیکن "یا" سے پہلے ہی خونخوار نگاہوں سے بھائی جان کو تکتا ، نیا نوکر کچن میں چل دیا ۔ اس کے پیچھے امّی جان بھی لپکیں ۔

۔۔۔ پھر وہ ہر ہر چیز کے بارے میں بتانے لگیں۔ دیکھو یہ آٹے کا ٹین ہے۔ اس میں اصلی گھی ہے دیکھ سمجھ کر خرچ کرنا۔ ورنہ باپ کا مال سمجھ کر چلے بے بھاؤ ڈالتے ہوئے۔ یہ مصالحے کی الماری ہے ۔۔۔ الائچیاں میٹھوں میں ڈالنے کے لئے ہیں۔ نہیں تو داماد بن کر چباتے مت بیٹھنا۔ یہ باسمتی چاول ہیں۔ ہم لوگوں کے لئے ۔۔۔ تمہارے لئے موٹا چاول الگ پکے گا۔" اسی قسم کی ہزار ہا نصیحتیں امّی جان کرتی رہیں ۔۔۔ امّی جان کی تقریر کے دوران نیا نوکر بار بار پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا جیسے کہ بھاگ نکلنے کی سوچ رہا ہو ۔۔۔ اس کا انداز سمجھ کر امّی جان بولیں۔

" بھاگنے کی کوشش فضول ہے، دیکھتے نہیں گیٹ پر السیشین کتّا کھڑا ہے۔ ذرا سے اشارے پر تکّا بوٹی کر دے گا۔"

نوکر نے آخری بار زبان کھولنے کی کوشش کی، مگر پھر اُسے وہی بات سُننے کو ملی۔

" اس گھر میں زبان کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں بس اپنے کام سے کام رکھو۔"

مرتا کیا نہ کرتا ۔۔۔ بے چارہ کام میں جُت گیا۔ دوپہر کے لئے ٹیبل لگا تو سب کی ناک بھوں چڑھ گئی ۔۔۔ کسی سالن میں نمک ہی نمک تھا کسی میں صرف مرچ۔ قیمہ اس قدر جل گیا تھا کہ لگتا تھا کہ کوئلے کے باریک باریک ٹکڑے کر کے پلیٹ میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ فیرنی میں صرف الائچیاں ہی الائچیاں تھیں اور روٹیوں کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ ہر قسم کے آڑے

ٹیڑھے ٹکڑے، کہیں کچے، کہیں جلے ہوئے۔ بھائی جان نے اسے جلانے کی خاطر کہا۔ "تم یہ نہ سمجھو کہ اس طرح بُرا بھلا پکا کر تم بچ جاؤ گے۔ اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ تم خاندانی باورچی ہو اور ہر قسم کا پکوان تمہیں خوب آتا ہے، خیر چند دن اپنے دل کی جلن یوں بھی مٹا لو۔" "خاندانی باورچی" کے خطاب پر نئے نوکر نے پھر گڑبڑا کر کچھ کہنا چاہا تو امّی جان تلخی سے ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"بس زبان نہ کھولو۔"

شام کی چائے کے وقت تک "خاندانی باورچی" کے تیور ہی بدل چکے تھے۔ نہا دھو کر انہوں نے ایک بڑھیا سی پتلون اور قمیص پہن لی تھی۔ اور چائے لے کر اس انداز سے اندر آئے کہ ٹرے اگر ان کے ہاتھوں میں نہ ہوتی تو کوئی نیا آدمی انھیں آسانی سے صاحب خانہ کہہ دیتا ــــ دم کی ہوئی چائے انہوں نے بے حد گونگوں کے سے انداز میں ایک ایک کو دی اور برتن اٹھا کر چلے گئے۔

"اب آیا نہ رستے پر" بھائی جان نے فخریہ کہا۔ امّی جان بھی خوش ہو کر بولیں۔ "بیٹے تم ٹھیک ہی کہتے تھے کہ ان لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہیئے۔"

یہ نئے نوکر کے آنے کے صرف تیسرے دن کی بات ہے کہ دوپہر کے وقت جب نیا نوکر ڈائننگ ہال میں کھانے کے لئے ٹیبل پر پلیٹیں سجانے کھڑا تھا کہ زن سے ایک ٹیکسی آکر رکی اور اس میں سے آپا میاں برآمد ہوئے سخت بھوک کے عالم میں وہ سیدھے کھانے کے کمرے کی طرف ہی بڑھتے چلے گئے ـــــ اور ان کے پیچھے پیچھے سب بچے، بھائی جان اور امّی جان بھی ـــ مگر ہال میں

داخل ہوتے ہی پہلے تو وہ ٹھٹھکے اور پھر حیرت اور خوشی سے چلّا کر آگے بڑھے۔

"ہیلو، پروفیسر — تم — مگر تم اس کمرے میں پلیٹیں لگاتے ہوئے ابھی کیا ماجرا ہے؟" انھوں نے گھوم گھوم کر ہر ایک کے چہرے کو دیکھا، سب دم سادھے ہوئے کھڑے تھے — امّی جان جیسے خواب میں بڑبڑائیں۔

"تو یہ وہ باورچی نہیں جنھیں آپ کے دوست نے دہلی سے بھیجا تھا" ابّا میاں نے سر پر ہاتھ مار کر کہا "اف میری یاد — میں کہنا ہی بھول گیا تھا کہ مجھے میرے دوست کا خط ملا تھا کہ اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے نوکر ابھی ایک ماہ نہیں آسکے گا۔ یہ خط مجھے روانہ ہونے سے بس آدھ گھنٹہ پہلے ملا تھا — اور بھئی یہ تو میرا طالب علمی سے جگری دوست ہے۔"

بھائی جان تو کبھی کے کمرے سے کھسک چکے تھے۔ بچے بھی ایک ایک کر کے کھسک رہے تھے۔ البتہ امّی جان بے چاری دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپے بیٹھی رہ گئی تھیں۔

خاندانی باورچی نے بے حد کھلے دل سے ابّا میاں سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "بھئی بمبئی میں پروفیسروں کی جو تعلیمی میٹنگ ہو رہی ہے اس کے لئے میں ایک ہفتہ قبل ہی چلا آیا تاکہ بمبئی گھوم بھی سکوں۔

لیکن یہاں تو بھابی نے مجھ پر کتّوں کا پہرہ لگا دیا ہے ــــ" اور وہ بے حد کھلے دل سے ہنسنے لگے ــــ "شاید میرا خط تمھیں نہیں ملا ــــ؟"

ارشد اس سُرخ امام ضامن کے بارے میں سوچ رہا تھا جو یقیناً پروفیسر کی امّی یا بہن نے باندھا ہوگا۔ جس کی وجہ سے وہ نوکر سمجھ کر پکڑ باندھ کر گھر لائے گئے ــــ اور امّی جان توبہ توبہ کرتی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ "اب سے میں کبھی نوکر نہ رکھوں گی ــــ" اور پروفیسر چچا ہنس کر ابا میاں سے کہہ رہے تھے۔ " آئیے کم سے کم میرے ہاتھوں کا پکا کھانا تو چکھ لیجئے۔"

بند دروازے

ممّی کچن میں مصروف تھیں۔ باہر بچّوں نے قیامت مچا رکھی تھی۔ ان کے شور کی وجہ ممّی کی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک دو بار انھوں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا بھی، لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ بس ایسا لگتا تھا کہ پچھواڑے کوئی میلہ لگا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں دھبڑ دھبڑ کرتے سارے بچّے کچن میں گھُسے چلے آئے۔

"ممّی ۔۔۔۔ ممّی پلیز چھ روپے ....." پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان جاوید میاں بڑے زور زور سے کہہ رہے تھے۔

ممّی کچھ نہ سمجھ کر ذرا جھلا کر بولیں۔ "پہلے سانس تو ٹھیک کر لو۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ اور یہ اپنے پیچھے فوج کیا لگا رکھی ہے؟"

جاوید میاں ذرا سنبھل کر بولے، "ممّی ۔۔۔۔ ممّی وہ ہم نے نا۔ وہ ہم نے ۔۔۔۔ وہ مٹھو بیچنے والا آیا نا تو اس سے چھ روپے میں ایک مٹھو خریدا ہے۔ ممّی اتنی پیاری باتیں کرتا ہے کہ بس ۔۔۔۔ وہ مٹھو والے نے پوچھا نا ممّی کہ میاں مٹھو تمھارا کیا نام ہے؟" تو ممّی انسانوں کی طرح بولنے لگا، "میرا نام میاں مٹھو ہے مجھے بھوک لگی ہے۔ مجھے روٹی دیجئے۔" اور مارے جوش کے جاوید میاں اچھلنے لگے۔ "اور ممّی ۔۔۔۔ آپ سوچئے تو سہی اتنے پیارے جیتے جاگتے کھلونے کی قیمت صرف چھ روپے! پلیز ممّی پلیز ۔۔۔۔" اور وہ مارے خوشامد کے

ممّی سے لپٹ کر جھول گئے۔

ممّی نے بڑی اداس نگاہوں سے پنجرے کو دیکھا جس میں ایک بے بس اور تنہا جان، ہجوم کے بے پناہ شور سے سہمی سہمی کونے سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ لرز کر بولیں۔ "نا بیٹا نا ــــــ ویسے چھ روپے کوئی بڑی بات نہیں تمھارے شوق پر سے صدقے۔ لیکن خدا کے لئے ایک آزاد جان کو قیدی نہ بناؤ مجھے بڑا رحم آتا ہے۔"

"ارے ممّی آپ بھی کمال کرتی ہیں! اس میں آزادی کی اور قید کی کیا بات ہے؟ مزے سے کھائے گا پئے گا عیش کرے گا۔ جسے کھانے پینے کو ملے اُسے آزادی اور قید سے کیا سروکار؟"

ممّی نے بڑی رحم بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ "ننھّے تم ابھی اتنے چھوٹے ہو کہ اتنی گہرائی تک پہنچ بھی نہیں سکتے کہ آزادی کیا ہے اور قید کیا ــــــ لیکن میں تو سمجھ سکتی ہوں۔"

لیکن قیدی پرند کی نگاہوں کی زبان کو جاوید میاں بھلا کیا سمجھ پاتے ادھر مٹھو والا شور مچانے لگا۔ "ارے میاں، کیوں میرا دھندا مندا کرتے ہو؟ لینا ہے تو لے لو ورنہ واپس کرو۔ کچھ ایسے تھوڑی ہی ہے کہ تم نہ لوگے تو بکے گا ہی نہیں۔ سیکھا پڑھا طوطا ہے۔ وہ تو تھیں بچّہ سمجھ کر دے رہا ہوں ورنہ کیا سولہ میں نہیں بک سکتا؟"

جاوید میاں نے بوکھلا کر کبھی ممّی کو اور کبھی باہر گیٹ کو تکنا شروع کر دیا۔

جہاں مٹھو والا کھڑا دہائیاں دے رہا تھا۔ ممّی نفیس کہ بگھلنے کا نام نہ لیتی تھیں مجبور ہو کر انھوں نے رونا شروع کر دیا۔ جیسا کہ ہمیشہ وہ ان موقعوں پر کیا کرتے تھے۔

ممّی آخر ماں ہی تو تھیں، اپنے لاڈلے کا رونا کیسے دیکھ پاتیں، ناچار انھوں نے جا کر الماری کھولی اور چھ روپے بیٹے کے حوالے کر دیئے۔

جاوید میاں کے پیچھے ان کی ساری فوج شور مچاتی پچھلے لان پر چلی گئی۔

جب بڑوں کے آفس اور چھوٹوں کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا تو جاوید میاں پنجرہ انگلی سے ٹکائے ممّی کے پاس آئے اور بولے: "ممّی ـــ پلیز ـــ جب تک میں اسکول سے نہ آجاؤں۔ اس کی حفاظت آپ کریں گی ـــ کریں گی نا۔ انھوں نے ادا اور لگاوٹ سے سر جھکا کر ممّی کی رضامندی لینی چاہی۔

لیکن ممّی کی آنکھوں میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے۔

جاوید میاں اسکول سے لوٹے تو بستہ پھینک سیدھے پنجرے کی طرف بھاگے۔ "ممّی آپ نے میرے مٹھو کو دانہ پانی تو ڈالا تھا نا؟ ممّی اس نے دانہ کھایا تھا نا؟ پانی تو پیا نا؟ اور اس نے آپ سے کتنی باتیں کیں ممّی؟" اور جب وہ قریب گئے تو انھوں نے بڑی اداسی سے دیکھا کہ پانی کٹوری میں جوں کا توں موجود ہے، اور ترکاریاں، سبزیاں ساری ویسی کی ویسی رکھی ہیں۔ ان کا دل بجھ گیا۔ اداس لہجے میں انھوں نے ممی سے پوچھا۔ "ممّی اس نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔ پانی تک بھی نہیں پیا۔ ایسے تو یہ مر جائے گا۔"

"ممی نے لوہا گرم دیکھ کر وار کیا، بیٹا وہ اپنوں سے بچھڑ کر آیا ہے نا۔ ابھی اس کا دل کھانے پینے کو نہ چاہتا ہوگا۔"

جاوید میاں کے ننھے سے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ جب کسی کو کھانے پینے کے سارے سامان مہیا ہوں تو پھر یہ یاد داد اور بچھڑنے والوں کا خیال کیا چیز ہوتی ہے۔ کچھ جھلاہٹ سے بولے۔ "کھانا پینا چھوڑ دے گا تو اپنا گھاٹا کرے گا۔ بھوک لگے گی تو خود ہی آئے گا رستے پر۔" پھر انہوں نے ذرا ناگواری سے پنجرہ ہلا کر کہا۔ "میاں مٹھو آخر تمہیں اور کیا چاہیئے۔"

مٹھو اس کونے سے اُٹھ کر دوسرے کونے میں چلا گیا ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جاوید میاں کے ناشتہ کرنے تک ان کے سارے دوست بھی کھا پی کر آ موجود ہوئے اور سب نے پھر سے پنجرے کو گھیر لیا۔

"بولو تو میاں مٹھو تمہارا نام کیا ہے؟" فوزی نے مسکرا کر پوچھا لیکن مٹھو نے کوئی جواب نہ دیا۔

بیٹو نے پنجرے کو ایک جھکولا دیا۔ "ارے بھائی اپنا نام تو بتاؤ"۔ مٹھو پھر بھی خاموش ہی تھا۔

"یہ تو کچھ بولتا ہی نہیں"۔ ببلی منہ بسور کر بولی۔ "بھائی جان یہ بولنا بھول تو نہیں گیا؟"

جاوید میاں ذرا الجھ کر بولے۔ "ایسے کیسے نہیں بولے گا! اس کے اچھو کو

بھئی بولنا پڑے گا! اور انھوں نے چلّا کر کہا، "میاں مٹھو تمہارا نام کیا ہے"۔
مٹھو سہم کر پر پھٹ پھٹا کر اِدھر سے اُدھر جا بیٹھا۔ بولا پھر بھی نہیں۔
خدا بخش اُدھر سے چائے کی ٹرے لئے گزرے تو نرمی سے بولے "بابا صاحب یہ ابھی نیا نیا آیا ہے نا ـــــ آپ سے گھلتے ملتے، بات کرتے اسے ذرا ٹیم لگے گا۔"
"پھر صبح مٹھو والے نے ہمارے سامنے اس سے نام پوچھا تو اس نے کیسے بتایا تھا؟" جاوید شکایتی لہجے میں بولے۔
"آپ سمجھے نہیں بابا صاحب ـــــ اس کا پالا ہوا تھا۔ اس سے ہلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے پوچھنے پر سب بتاتا تھا ـــــ ایسی گڑبڑ نئے پنچھی کے ساتھ ٹھیک نہیں۔" اور وہ ٹرے سنبھالے چل دیئے۔
"ہونہہ ـــــ" جاوید میاں چڑ کر بولے۔ "ہمیں سب پتہ ہے۔ یہ بڑے لوگ اصل میں چاہتے ہیں کہ ہم مٹھو نہ پالیں۔ کیوں نہ پالیں صاحب؟ ضرور پالیں گے، کوئی ہم نے قید کیا ہے۔ ہم نے تو پیسہ دے کر خریدا ہے۔"
ان کا موڈ بگڑ گیا تھا۔
بھوک کی برداشت نہ انسان کو ہے نہ جانور کو۔ دوسری صبح جب جاوید میاں بھاگے بھاگے مٹھو کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر اُن کی خوشی کی حد نہ رہی کہ کٹوری میں پانی بھی کم تھا اور سبزی ترکاری بھی کتری ہوئی، یہاں وہاں بکھری پڑی تھی۔ اور مٹھو میاں صبح کی ٹھنڈی ہوا سے مست ہو کر خوشی میں ٹیں ٹیں کرتے کرتے اپنے پنجرے میں خوب چہک رہے تھے۔

"یہ ہوئی ناکوئی بات!" جاوید خوشی سے اور فخر سے چلّائے اور دوڑے دوڑے پورے گھر میں پھرے ممّی سے لے کر پپّا تک، پنکی سے لے کر روبی، شوکی، اشرف، پڑپڑوس کے چنّو، فوزی، کوکی، پپّو ــــ حد یہ کہ نوکروں تک کو جا سنایا کہ بھئی وہ مٹھو میاں من گئے ہیں اور یہ کہ انہوں نے بھوک ہڑتال ختم کر کے کھانا پینا شروع کر دیا ہے۔

دن گزرے تو مٹھو بالکل جاوید میاں کا ہو کر رہ گیا۔ اب تو وہ جاوید میاں کے سکھانے پر ان کے تمام دوستوں کے نام بھی یاد کر چکا تھا۔ اتنی پیاری پیاری اور حیران کر دینے والی باتیں کرتا کہ دیکھنے والے ہی یقین کر سکتے ــــ جاوید میاں کی خوشی کے کیا کہنے ــــ وہ اکثر ممّی کو قائل کرنے کی کوشش کیا کرتے۔

"ممّی آپ تو کہتی تھیں ناکہ کسی پنچھی کو قید نہیں کرنا چاہیے۔ بُری بات ہے۔ اس کا دل نہیں لگتا، وہ اپنوں سے بچھڑ جاتا ہے تو دنیا اسے اچھی نہیں لگتی۔ اب دیکھیے نا، یہ پنجرے میں رہتا ہے، لیکن مزے میں کھاتا پیتا ہے، باتیں کرتا ہے۔ کبھی اس کا دل چاہتا ہوگا کہ آزاد ہو جائے؟"

"بیٹے یہ تو مجبوری کا سودا ہے۔ اب بے چارے کو باہر جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں اور آس بھی نہیں تو کیسے بھو کا رہے، میں تو تب مانوں کہ تم اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دو اور یہ نہ اڑے ــــ تب کہوں گی کہ ہاں، وہ تم سے خوش ہے اور بچھڑنا نہیں چاہتا۔"

"ممّی میں یہ نہیں مانتا ـــ دیکھئے نا، اس کے پنجرے میں کیا کچھ نہیں ہے یہ اس کا پسندیدہ کچّا آم، یہ ہری مرچیں، یہ گاجریں، یہ اتنی ساری سبزیاں ـــ اِدھر پانی، اُدھر جھولنے کے لئے ننھی سی پالکی۔ آپ بھی غضب کرتی ہیں ـــ صرف دروازے ہی تو بند ہیں نا، تو مجھے اتنا بتا دیجئے کہ اتنے عیش کے ہوتے اگر صرف دروازے بند رہیں تو کیا فرق پڑتا ہے ؟"

ممّی اداس سی ہنسی ہنس کر چپ رہ گئیں۔

تھوڑے دنوں بعد ممّی کو خالہ امّی نے بلوایا۔ اتوار کا دن تھا۔ سب کی چھٹی تھی ـــ سب جانے کو تیار تھے۔ بچّے سب سے پیش پیش تھے۔ خالہ امّی کے ہاں مزہ بھی کتنا آتا تھا۔ ہر قسم کے ہر موسم کے پھلوں کے درخت ان کے ہاں موجود تھے۔ کبھی کچّے بیر ہیں، کبھی کچّی املیاں، کبھی کھٹی میٹھی نارنگیاں تو کبھی کچّے آم، ان کا کھانا اور ان کا مزہ اٹھانا الگ بات اور درختوں پر اُدھم مچانا وہ الگ اور نرالی ہی بات تھی۔ آجکل کچّی کیریوں کا موسم تھا۔ کچّے پکّے آموں کو نمک مرچ سے، یا شکر سے، یا ایسے ہی سادہ کھانے کا جو مزہ تھا، اور اس کے تصوّر ہی سے منہ میں جو پانی بھر آتا تھا، وہ سب کو جانے پر اکسانے کو بہت کافی تھا۔ جب سب تیار ہونے لگے تو ممّی نے دھیرے سے پوچھا۔ "اچھا سب ہی جا رہے ہیں تو یہ تو بتاؤ تمھارے مٹھو کے پاس کون رہے گا بیٹے ؟"

"مٹھو کے پاس ؟" جاوید میاں حیرت سے بولے۔ "کیوں اس کی کوئی ہی

ضرورت ہے ؟ ہم اس کے پنجرے میں کھانے پینے کا سارا سامان رکھ جائیں گے۔ بھوک لگے گی تو کھائے گا، پیاس لگے گی پانی پی لے گا۔"

"وہ تو ہے بیٹیا۔ لیکن بلی وِلی کا بھی ڈر رہتا ہے نا۔"

"تو ممّی ـــــ ہم اُسے اندر والے کمرے میں رکھ دیں گے۔"

"نہ بیٹا ـــــ اندر کیسے رکھ سکتے ہیں؟ جب پورا گھر ہی بند کر کے جائیں گے تو پتہ نہیں ہمارے پیچھے اس پر کیا بیتے۔"

دراصل ممّی تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھی تھیں اس لئے نئی نئی باتیں نکال کر جاوید میاں کو مجبور کر رہی تھیں۔

وہ اُچھلے۔ "ارے ممّی خدا بخش کو نہ چھوڑ جائیں؟"

"لو اور سنو ـــــ تمھیں پتہ ہے ممّی ان سے کتنی ہلی ہوئی ہے۔ وہ تو وہاں رو رو کر اور انھیں یاد کر کر کے جان ہلکان کرے گی۔"

"تو پھر ممّی، پنجرہ ہی ساتھ نہ لے لیں؟" جاوید میاں بے حد خوشی خوشی بولے۔

"ترکیب ٹھیک تو ہے ـــــ لیکن یہ بھی سوچ لو کہ اگر وہاں کسی نے شرارت میں پنجرہ کا دروازہ کھول دیا تو کیا ہوگا؟"

ایک ایک کر کے جب ان کی ہر ترکیب رد ہوتی گئی تو ممّی نے آخری تجویز پیش کی۔ "بیٹے دن بھر کی تو بات ہے تم خود ہی کیوں نہ اپنے ٹھٹھو کے پاس رہ جاؤ؟"

"میں ـــــ میں اکیلا؟" وہ ذرا گھبرائے۔

"کیوں ـــــ کیوں؟ ٹھٹھو جو رہے گا ـــــ اور پھر ہم تمہارے دن بھر کے

کھانے پینے کا پورا سامان تمہارے کمرے میں رکھ جائیں گے۔ گھر کھلا چھوڑ جانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا۔ بس اتنا ہوگا کہ دروازے بند رہیں گے۔ باقی تو تمہیں سب کچھ میسر ہوگا۔"

مٹھو سے جاوید میاں کو جو بے پناہ لگاؤ تھا اس نے انھیں اس ایثار پر بھی آمادہ کر ہی دیا کہ دن بھر اس کی خاطر اکیلے رہ جائیں اور ممّی پپّا اور سب لوگ جاتے جاتے باہر سے دروازے بند کر جائیں۔ صرف آٹھ گھنٹوں ہی کی تو بات تھی۔ گیارہ بجے صبح کے گئے یہ لوگ سات بجے شام کو لوٹ آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ آٹھ گھنٹے بتا دینا ایسی کون سی بڑی بات تھی۔ جب کہ ان کے آس پاس ہر قسم کا عیش کا، کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ انھوں نے خوش ہو کر دیکھا، ایک پلیٹ میں کیک۔ ایک میں حلوہ، ایک میں مٹھائیاں، ایک میں دوپہر کے لئے ابھی سے کھانا لگا دیا گیا تھا۔ پھر ممّی نے مارے محبت کے پھل بھی بہت سے رکھ دیئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پیکٹ چاکلیٹ اور بسکٹ الگ تھے۔

سب لوگوں کے جاتے ہی سب سے پہلے جاوید میاں نے ڈٹ کے مٹھائی کھائی پیٹ بھرا تو سستی نے آگھیرا، وہ ذرا لیٹ گئے تو آنکھ لگ گئی۔ جاگے تو سمجھے بہت وقت بیت گیا ہوگا، لیکن صرف آدھ ہی گھنٹہ گزرا ہوگا — انہوں نے وقت گزاری کی خاطر سیب پر دو تین مونہہ مارے، ایک دو سنترے چھیلے، کچھ پھینکے کچھ مٹھو کو عنایت کئے — مٹھو سے کچھ باتیں کیں۔

لیکن بڑی بوریت ہو رہی تھی۔ سوچا ذرا اپنے دوستوں کے ساتھ کرکٹ ہی کھیل آئیں۔ دروازے تک گئے تو پتہ چلا کہ دروازے بند ہیں، ناچار کمرے میں لوٹ آئے۔ دو چار چاکلیٹ اٹھا کر منہ میں ڈالے۔ دو چار کا نشانہ باندھ باندھ کر لان میں گھومتی بلّی کو مارا۔ جب اس سے بھی دل اچٹ گیا تو سوچا چلو کچھ قصے کہانیاں ہی پڑھیں۔ کتاب کھولی۔ ہر بار تو یہ ہوتا تھا کہ پڑھنے جو بیٹھے تو گھنٹے گزر گئے، ممّی کھانے کے لئے پکارے جا رہی ہیں، خدا بخش بار بار چلّا رہا ہے، میاں کھانا کھا لیجئے۔

بابا صاحب کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے لیکن ان کا دھیان ہی نہیں ٹوٹتا — اب جو دیر تک پڑھائی کے بعد نگاہ اٹھائی تو گھڑی صرف پونے بارہ بجا رہی تھی۔ سوچا اور کچھ نہیں تو چلو کھانا ہی کھا لیں۔ پھلوں، مٹھائیوں، چاکلیٹوں سے پہلے ہی پیٹ بھرا پڑا تھا کیا کھایا جاتا۔ دو چار لقمے یونہی مونہہ میں ڈالے اور پلیٹ چھوڑ کر اٹھ گئے۔ اچانک انھیں خیال آیا کہ کیرم بورڈ، سانپ سیڑھی یہ سارے کھیل کر تو بہت سا وقت گزارا جا سکتا ہے۔ لیکن سب کھیل کا سامان جمع کیا تو انھیں یہ احساس ہوا کہ ان کھیلوں میں تو ساتھیوں کی ضرورت پڑتی ہے پہلی بار اس بھیانک پن کے، اکیلے پن کے احساس کے ساتھ انھوں نے مٹھو کے پنجرے کی طرف دیکھا۔ تنہا مٹھو۔ پروں میں مونہہ ڈالے، اونگھتا کھڑا تھا۔ طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن پر حملہ آور ہوئے لیکن انہوں نے ہر خیال کو جھٹک دیا۔ وہ بڑی اداسی کے عالم میں کھڑکی میں

جا کھڑے ہوئے۔ باہر نگاہ گئی تو دیکھا کہ ان کے سارے پڑوسی ساتھی اتوار کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یہ پھر باہر کی طرف لپکے کہ ساتھیوں میں رل مل جائیں لیکن بند دروازے سے ان کا سر ٹکرایا اور نیلا نیلا سا نشان ماتھے پر ابھر آیا۔ ماتھا سہلاتے خشک آنکھوں کے نظر نہ آنے والے آنسو پیتے وہ پھر کمرے میں پلٹ آئے۔ انہوں نے کمرے کے ماحول پر ایک نظر ڈالی۔ ڈھیر ساری کھانے کی ایک سے ایک مزے دار چیزیں، پڑھنے کو کتابیں، سننے کو گراموفون، بڑھیا آم کا رس، ان کا پسندیدہ اورنج اسکواش، دودھ ــــــ جی نہ چاہے تو سادہ پانی ــــــ پھر ممّی کپڑوں کے دو جوڑے بھی رکھ گئی تھیں۔ کیا نہیں تھا؟ صرف دروازے ہی تو بند تھے نا گھر کے۔

"پھر میرا دل کیوں نہیں لگتا؟" انھوں نے ایک بار پھر چور نگاہوں سے پنجرے کی طرف دیکھا۔ مٹھو کے پاس بھی اس کی ضرورت بھر کا سارا سامان رکھا ہوا تھا۔ ان میں اور مٹھو میں کوئی بات ایک سی ضرور تھی، لیکن ابھی وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک بے کلی کا احساس تھا جو دل کو مسوسے جا رہا تھا ــــــ پھر ان کا چھوٹا سا دل ایک دم اپنے پپا، بھائیوں، بہنوں، نوکروں، دوستوں اور سب سے بڑھ کر اپنی ممّی کے لیے مچل اٹھا اور انہوں نے کونے میں منہ چھپا کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔

اور پھر جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اچانک آ گئی کہ یہ روگ جو انھیں کھائے جا رہا تھا۔ تنہائی اور قید کا روگ تھا۔ روتے روتے پتہ نہیں کب

ان کی آنکھ پھر سے لگ گئی۔ جب وہ جاگے تو دن ڈھل رہا تھا اور ان کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ان کی نگاہ سامنے جا ٹپڑی۔ تنہائی کا مارا طوطا بھی سر جھکائے مرچیں کتر کتر کر کھا رہا تھا۔ ان کے رکے ہوئے آنسو تیزی سے ابلنے لگے وہ لپک کر اٹھے اور بھرائی ہوئی آواز سے بولے۔ "تجھے بھی میری طرح اپنی ممّی، بھائی، بہن، پپّا، ساتھی سب یاد آتے ہوں گے نا ــــ جا تو بھی ان میں مل جا۔" اور انہوں نے پنجرے کا بند دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ مٹھو نے بے یقینی کے انداز میں پہلے تو اپنے پر پھٹ پھٹائے۔ پھر احسانمند نگاہوں سے اپنے محسن کو دیکھا اور کھڑکی کی راہ سیدھا باہر اڑتا چلا گیا۔ جاوید میاں دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھے تھے۔ خوشی اور سکون کا ایسا احساس انھیں زندگی میں کبھی نہ ملا تھا! اس نے ان کے آنسوؤں کو ایک بار اور راہ دے دی۔

ــــ وہ اکیلے میں پھپھک پھپھک کر رونے لگے۔

باہر کار کے رکنے کی آواز آئی ــــ پھر بند دروازے چرچرائے اور ایک ایک کر کے سب گھر میں داخل ہوئے۔ ایک دم جاوید میاں برسوں کے بچھڑے ہوئے کی طرح جا کر سیدھے ممّی سے لپٹ گئے۔

"ممّی مجھے اب پتہ چلا کہ بند دروازوں کے پیچھے جینا کیسا عذاب ہے!"

خالی پنجرہ دیکھ کر سب سوالوں کی بوچھار کئے دے رہے تھے۔ "مٹھو کہاں گیا؟"

"مٹھو کیسے اڑا؟"

"مٹھو کو کون لے گیا؟"

"لیکن یہ صرف ممّی جانتی تھیں کہ مٹھو کیسے اُڑا!"

امن کانفرنس

جب میز کے آزو بازو چاروں کرسیاں جمائی جاچکیں، تو رازی میاں بڑے اطمینان اور بزرگی والے انداز میں مڑ کر بولے۔

"جناب راشد — مسٹر ٹیلو — اور آپ محترمی پپو! — آیئے اب یہاں تشریف رکھیے اور اپنی کانفرنس کا افتتاح کیجیے۔"

سب چاروں کرسیوں پر آبیٹھے اور اتفاق رائے سے رازی میاں کو صدر منتخب کیا گیا — چنانچہ جناب صدر کھنکارتے ہوئے بولے۔

"جیساکہ آپ جانتے ہیں، یہ شکریہ وکریہ بالکل رسمی سی چیز ہے اس لیئے میں معافی چاہوں گا — اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ گھر میں امن کس طرح قائم کیا جائے — جیساکہ آپ سبھی جانتے ہیں، ہمارا یہ گھر — گھر کا ہے کو ہے بوچڑ خانہ ہے، مچھلی بازار ہے، بلکہ اس قبیل کا کوئی اور لفظ ہو تو وہ بھی آپ یاد دلادیں — ہاں تو آپ جانتے ہیں کہ اس شور پکار میں پڑھنا — میرا مطلب ہے اسٹڈی کرنا اس قدر مشکل کام ہے کہ جب کتابیں کھولتے ہیں تو حروف کی بجائے جیسے الفاظ بولتے ہیں —

"اوں، اِیں — میرا لٹو پٹو نے کر بھاگ گیا —"

"ابے نامعقول میری گیند کس نے چھپا دی؟"

"تو بہ میرے لفافے کے اسٹامپ کس نے نوچ ڈالے ـــــ"

تو جناب سامعین! ـــــ میرا مطلب یہ ہے کہ اس شور شرابے میں نہ صرف چھوٹے بلکہ کسی حد تک بڑے بھی شامل ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا ٹھوس اقدام کیا جائے، ایسا ریزولیشن پاس کیا جائے کہ بس ...." بات پوری ہونے سے پہلے ہی داد ملنے لگی۔

" او۔یس (O.YES)" پپّو نے کانونٹ زدہ شان ماری۔

" بالکل درست" ٹلّو بولے۔

" ہاں بالکل ٹھیک ہے۔" راشد منمناہٹ سے بولے۔

" ہم سب چاہتے ہیں کہ گھر میں ایک ایسی پُرامن فضا قائم ہو جائے کہ پرند پر نہ مارے ـــــ یہ دوات جو اس میز پر دھری ہے، ایسا نہ ہو کہ ہمارے اِدھر اُدھر ہوتے ہی گل کاری کرنے لگے ـــــ رات کے اندھیرے میں بھی ٹٹولیں، تو ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ملے ـــــ اسکیل بچّوں کے لئے گھوڑا گاڑی کا کام نہ دینے لگے۔"

پپّو اس تقریر سے ذرا بور ہونے لگے تھے اور بار بار چھوٹی میز پر دھری مٹھائی اور نمکین کھاجے کی پلیٹ کو گھورتے جاتے تھے، جو کانفرنس کے سلسلے میں مہمانوں کی خاطر مدارات کے لئے سجائی گئی تھیں۔ معزز صدر نے چوٹ کی۔

" اور ہر چند کہ یہ کانفرنس کا ایک حصّہ نہیں ہے کہ لوگوں کا سدھار

کیا جائے کہ وہ بھکاری پن چھوڑ دیں۔ تاہم یہ بھی ہمیں کو سوچنا ہے۔"
پپّو نے ہڑبڑا کر مٹھائی پر سے نگاہیں ہٹالیں۔
راشد مسلسل اُودی، نیلی لال لال پنسل کی تیز نوک کو تاکے جا رہے تھے۔
معزّز صدر کی نگاہیں بھی کافی تیز تھیں۔ تقریر جاری رہی۔
"اور یہ چیز انتہائی خطرناک ہے کہ بستوں میں سے نئی پنسلیں، نئی کاپی کا پیاں اور کتابیں غائب ہو جائیں اور چور کا پتہ ہی نہ چلے۔ (تالیاں)
"اخلاق سکھانا بھی ہمارا ہی فرض ہے یہ نہیں کہ گرمی کی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے اگر بچّوں کے سر منڈوا دیئے ہوں، تو اُن بچّوں کے سر پر چاند ماری کی مشق کی جائے۔"
ٹلّو بُری طرح سراسیمہ ہو گئے، کیونکہ وہ اِن گنوں کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔
"اور ہمیں یہ بھی چاہیئے کہ آپس میں بھی اخلاق سے رہیں۔ لڑائی، دنگے اور جھگڑوں سے بچیں۔ فضول گالی گلوچ نہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح مِل جُل کر رہیں کہ واقعی امن پسند شہری ——"
ذرا رُک کر صاحبِ صدر بولے ——"یہ ترکیب غلط ہوگی، اس لئے کہ ہم شہر کے لئے امن کانفرنس نہیں کر رہے۔ گھر کے، اپنے مکان کے لئے کر رہے ہیں، تو ہمیں چاہیئے کہ واقعی صحیح معنوں میں "امن پسند مکانی" بن کر دکھا دیں —— جو ذرا بھی احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کی ایسی خبر لی جائے کہ حضرت کی نانی مر جائے....." صاحبِ صدر کی بات

منہ ہی میں تھی کہ ٹلّو ذرا چڑ کر بولے :

" جنابِ صدر نے بڑی غلط زبانی سے کام لیا ہے ـــ یہ اگر پوری نہیں تو آدھی گالی ضرور ہے "

راشد بھی خفا ہو کر بولے ـ " اس صورت میں جب کہ ہماری نانی جان بقیدِ حیات ہیں، یہ بات واقعی آپ نے غلط کہی ہے "

پپّو موقع پا کر مٹھائی کو گھورتے ہوئے بولے ـ " چراغ تلے ہی اندھیرا ہوتا ہے "

" مگر جناب ـــ " صاحبِ صدر اپنے بچاؤ میں بولے ـ " یہ تو محض ایک ترکیب ہے، گالی نہیں اور اسے تو اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند نے بھی اپنے ناول میں استعمال کیا ہے "

پپّو مسلسل مٹھائی کو گھورتے ہوئے بولے ـ " یقیناً ان کی نانی کا انتقال پہلے ہی ہو چکا ہوگا ـــ " اور تائید کے لئے راشد کی طرف دیکھا ـ

راشد تاؤ کھا کر بولے ـ " جنابِ صدر صاحب یہ ترکیب نہیں کوسنا ہے ـ آپ چاہتے ہیں کہ میری نانی مر جائیں ـــ وہ ہم سے اتنی محبت کرتی ہیں ـــ راتوں کو کہانیاں سناتی ہیں، دن کو مٹھائیاں کھلاتی ہیں ـ " پپّو نے سینے پر ہاتھ مارا ـــ " ہائے مٹھائی " اور آپ ان کے یوں لتّے لے رہے ہیں ـــ "

راشد نے بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے میز پر زور سے ہاتھ مارا اور جنابِ حاضرین کی نظر بچا کر لال، اودی پنسل اٹھا کر نیکر کی جیب میں ڈال لی ـ

راشد کو تو مطلوبہ چیز مل گئی، مگر ٹپو کو مٹھائی ــــ ؟؟ اُف ! یہ کیسی بات ہوئی ــــ ؟ ٹپو، راشد سے بھی زیادہ تاؤ کھا کر اُٹھے اور مٹھائی کی پلیٹ لاکر بڑی میز پر پٹخ کر بولے۔

" دنیا کی نانیاں مر گئیں، تو ایسی مٹھائیاں کون کھلائے گا ــــ" اور انھوں نے احسانوں کا اعتراف کرنے کی خاطر ایک رس گُلا منہ میں ڈال لیا۔

ٹلّو نے دیدے پٹ پٹا کر دیکھا ــــ اور رازی، جناب صدر تو اس حادثے سے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بیک وقت تین گلاب جامنیں منہ میں ٹھونس کر بق بق کرتے ہوئے بولے۔

"کس کم بخت نے نانی کو کوسا ہے۔ وہ تو ایک ترکیب محض تھی جناب!"

ٹلّو نے بھر ہاتھ مٹھائی اُٹھا کر صفا بیٹ میں انڈیل لی اور چبانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

راشد نے جب یہ گڑبڑ دیکھی تو باقاعدہ اُلجھ کر بولے۔"صاحب صدر ابھی ابھی آپ اخلاق پر درس دے رہے تھے، یہ اخلاق ہے کہ آپ بیک وقت دس دس رس گُلے ایک منہ میں ڈال لیں ــــ ؟"

رازی کو جھوٹ سے سدا چڑ تھی، چڑ کر بولے "میں نے دس کھائے ــــ ؟"

"اور کیا ایک کھایا ــــ ؟"

"تمھیں کس نے منع کیا تھا ؟"

[illegible]

"یہ بات ـــــ ؟"

"یہ بات ـــــ !"

پہلے اسکیل اٹھی ـــ پھر دوات نے گلکاری کی پھر فریقین آپس میں اُلجھ پڑے ـــ میز گری تو سارا سامان بھی گرا۔ کرسی گری، تو صاحبِ کرسی بھی چاروں خانے چت ـــ ایک وحشت، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ـــ ساتھ ساتھ بُرا بھلا، مار دھاڑ، دھول دھپّا بھی جاری تھا ـــ گالیوں اور کوسوں کا وہ طوفان تھا کہ نانیوں کو چھوڑ پرنانیاں، سگڑھ نانیاں تک بھی مار دی گئیں۔

چیخ و پکار سُن کر بازو کے کمرے سے ابّا دوڑے آئے ـــ ہائیں ہائیں کر کے سب کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کیا اور قیامت سے پہلے قیامت دیکھ کر بولے :-

"یہ کیا سلسلہ تھا بھئی ـــ کاہے کی گڑبڑ تھی ـــ یہ ؟؟"

دازی سر کھجا کر، چبا چبا کر بس اتنا ہی بول سکے ـــ

"جی ـــ جی ـــ وہ ہم ذرا امن کانفرنس کر رہے تھے کہ گھر میں امن کیسے قائم رہے !"

الزام

ڈاکٹر سلیم ـــــ انھیں ہمارے فیملی ڈاکٹر یا خاندانی معالج کہہ لیجئے ـــــ اس قدر صحت مند اور چاق و چوبند ہستی تھے کہ جس کی حد ہی نہیں۔ بے حد ہنس مکھ، حد درجہ زندہ دل، ہر بات کو مذاق میں ہنس کر ٹال جانے والے۔ اور کوئی بیماری تو شاید انھیں ہو بھی سکتی تھی لیکن ہارٹ اٹیک تو ہو سکتا ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ کسی بات کو محسوس کرتے ہی نہیں تھے۔ (اور عام طور پر یہی سنا گیا ہے کہ ہارٹ اٹیک عموماً ان لوگوں کو ہوتا ہے جو زیادہ کام کرتے ہوں، یا بہت حساس ہوں، یا ہر بات کو محسوس کرتے ہوں) لیکن پچھلے دنوں جب ڈاکٹر سلیم منّے میاں کو دیکھنے کے لئے آئے تو.....

قصہ دراصل یہ ہے کہ آبا کے کوئی بہت ہی گہرے دوست آنے والے تھے۔ انھوں نے امّی سے کہا تھا، بیگم ہمارے دوست لندن سے ایک زمانے کے بعد پلٹ رہے ہیں۔ وہاں کے پھیکے سیٹھے بدمزہ کھانے کھاتے کھاتے وہ بے حد اکتا گئے ہوں گے۔ آپ کے ہاتھوں کے کھانے کے وہ ہمیشہ سے مداح رہے ہیں۔ ایسی شاندار دعوت کیجئے بیگم کہ مرزا صاحب لوٹ پوٹ ہو جائیں۔

یقیناً امّی کسی باورچی کے خاندان سے نہیں ہیں، لیکن کھانے اس قدر [illegible]

بات ماننے میں بھلا کیا عار ہو سکتا تھا ـــــ فوراً ہی ایک مزے دار دعوت کا انتظام شروع ہو گیا۔

بیچ کی تفصیل میں جانے سے کوئی حاصل نہیں ـــــ ہوا یہ کہ جب مرزا چچا آئے تو ایک بار تو وہ بھی کھانے کی میز (بلکہ میزیں) دیکھ کر چکرا گئے۔ بہرحال تعریفوں کے پُل پیشگی باندھے گئے۔

اور کھانا کھانے کے بعد یہ ہوا کہ مرزا چچا کو بس اسٹریچر میں نہیں ڈالا گیا بلکہ بہ مشکل انھیں کی کار میں سوار کرا کے ابا نے خاص طور سے دو، دو نوکر ساتھ کر دیئے کہ "صاحب کو اچھی طرح سنبھال کر اُن کے بستر پر سُلا آنا۔"

خیر مرزا صاحب تو چلے گئے، لیکن ہوا یہ کہ اُن کے جانے کے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد رات کے کوئی ۱۲ بجے منّے میاں نے ہائے وائے مچانی شروع کی۔ ظاہر ہے خطرے کا بگل بجتے ہی سب ان کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ منّے میاں کے بارے میں پہلے ایک چھوٹی سی بات آپ کو بتا دوں کہ ہمارے ہاں ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں اناج کی قلت کے واحد ذمّہ دار منّے میاں ہیں۔ حکومت کی ایک خاص اجازت کے ذریعہ اکیلے منّے میاں کے چار راشن کارڈ بنوائے گئے ہیں۔ خیر ان باتوں سے (اگر وہ پڑھ لیں) منّے میاں کی دِل شکنی ہو گی۔ اس لئے اس ذکر کو چھوڑ دیئے۔ اصل بات سنئے کہ ڈاکٹر سلیم کو ہارٹ [illegible]

نہیں چل سکا ہے کہ وجہ کیا تھی جو ڈاکٹر صاحب چکر کھا کر گر پڑے تھے ؟)
بہرحال سب لوگ منّے میاں کے کمرے کی طرف دوڑے۔ پتہ چلا کہ منّے میاں سخت قسم کے پیٹ کے درد کا شکار ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام رکھا ہے اور چلائے جا رہے ہیں۔ لازماً ماں ہونے کے ناطے سب سے زیادہ امّی ہی پریشان ہوئیں۔

"ہائے میرے لال کو کیا ہوا ــــ" (حالانکہ رائے عامّہ یہ ہے کہ امّی کو یوں کہنا چاہئے کہ ہائے میرے کالے کو کیا ہوا)

مگر لال منہ سے بولنے کی سدھ میں نہیں تھے ــــ بھائی جان نے ڈرائنگ روم میں جا کر فوراً ڈاکٹر سلیم کو فون کیا۔ "معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب بڑے ناوقت آپ کو تکلیف دینی پڑ رہی ہے، مگر کیا کیا جائے، منّے میاں کی طبیعت سخت خراب ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں کار کی آواز آئی۔ پتہ چلا ڈاکٹر صاحب آ چکے ہیں۔ (اس وقت تک بھی، کچی نیند سے جاگ کر آنے کے باوجود، ڈاکٹر صاحب ایک دم تندرست اور بھلے چنگے تھے۔)

حسب معمول ڈاکٹر صاحب نے آکر اپنا بکس کھولا۔ سینے، نبض، زبان وغیرہ کا معائنہ کیا۔ (خود کا نہیں منّے میاں کا) پیٹ کو بہ مشکل دبا کر دیکھا۔ اور پاس کھڑے ہوئے ابّا سے پوچھا "منّے میاں نے رات کو کھایا کیا تھا؟"

ہمیشہ ساتھ ہی رہتے تھے، جھٹ سے بول اٹھے۔ "ارے ڈاکٹر صاحب پوچھئے نہیں، آج تو منّے میاں نے حد کردی، یہ سمجھئے اکیلے اتنا کھانا کھا گئے کہ بیس لوگ خوشی سے ہیضہ سے مر سکتے تھے۔" اک دم باوجود تکلیف کے منّے میاں چلا اُٹھے ـــ "یہ الزام ہے۔ چنو بکتا ہے ......"
اور وہ پھر درد کی لہروں میں بہنے لگے۔

"اچھا اچھا، ڈاکٹر صاحب انھیں مناتے ہوئے بولے (اس لمحے تک بھی بے چارے ڈاکٹر صاحب بالکل اچھے تھے) آپ ہی بتائیے کہ کہ آپ نے کیا کیا کھایا تھا۔؟"

منّے میاں نرم پڑ کر کچھ سرساری سے بولے ـــ "جی ڈاکٹر چچا میں نے تو ہر چیز ذرا ذرا چکھی تھی۔ البتہ مُرغ بریانی امّی بہت مزے کی پکاتی ہیں تو ہیں نے دو مرغ کی ٹانگیں، ایک قاب بریانی، دہی کی چٹنی کے ساتھ یوں ہی کھالی تھی کہ ابھی اور بھی دوسری چیزیں چکھنے لائق تھیں، پھر میں نے ایک مرغ مسلّم، تین چار شیرمالوں کے ساتھ چکھا۔ پھر دس بارہ دہی بڑے موہنہ میں رکھ لئے۔ پتہ نہیں امی نے دسہری آم کہاں سے حاصل کر لئے تھے، آٹھ دس وہ بھی چکھ لئے تھے۔ تلے ہوئے کلیجی گردے تو انسان یونہی چلتے ہوئے کھالیتا ہے۔ مٹھائیوں سے مجھے کوئی خاص رغبت، آپ تو جانتے ہی ہیں کبھی سے نہیں، لیکن امی جو مٹھائی گھر میں بناتی ہیں، وہ تو میں ضرور

[illegible]

بارہ گلاب جامن، کٹورہ بھر باسندی، چھوٹی کٹوری بھر ربڑی، آپ خود بھی سوچ سکتے ہیں کہ ایک بچہ آخر کتنا چکھ سکتا ہے؟ (اس لمحے تک بھی ڈاکٹر صاحب بالکل بخیر تھے ـــ البتہ آنکھیں کچھ پھیلنے لگی تھیں) میٹھا کھانے سے میری طبیعت اکثر کچھ مالش کرنے لگتی ہے۔ اس لئے میں پھر دوسری ٹیبل پر آگیا اور مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ایک تیسری ٹیبل بھی سجی ہوئی ہے ـــ اب کے بکرے کی ایک بھنی ہوئی ٹانگ، تلے ہوئے روسٹ کی ایک قاب، سنبوسے (جو بٹیر کے قیمے سے بنائے گئے تھے) ایک پلیٹ چنے مٹر، آلو چاپ، چھ سات کوفتے چکھے۔ اب تک میں نے روٹی کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا اس لئے دس بارہ چپاتیاں قورمہ لیکر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے یاد آیا ابھی میوے تو میں نے چکھے ہی نہیں تو ذرا سا قورمہ، یہی کوئی کٹورہ بھر صرف چھ چپاتیوں سے چکھا، اور کوئی آدھ کلو تلے ہوئے کاجو، چھوٹی طشتری بھر بھنے ہوئے اخروٹ۔ دماغی طاقت کے لئے دو تین مٹھی بادام، اور چلغوزے چکھ ہی رہا تھا کہ خیال آیا......"

لیکن اسی دم اپنے بکس، اسٹیتھو اسکوپ اور انجکشن کی سرنج لئے ڈاکٹر صاحب چکرا کر گر پڑے سخت بے ہوشی کا عالم طاری تھا، جب ڈاکٹر ہی خود بیمار پڑ جائے تو پریشانی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اس بات کو کافی دن گذر گئے ہیں۔ خدا کے فضل سے منے میاں بالکل صحت مند ہیں لیکن آج تک یہ نہ پتہ چل سکا کہ اتنے تندرست ڈاکٹر صاحب پر کیا افتاد آپڑی تھی۔

سزائیں

کہاں تو اچھے بھائی کو پیاری امّی پر وہ بھروسہ تھا کہ تعریف کرتے منہ سوکھتا اب امّی عین موقع پر صفا چوٹ دے گئیں۔ ایسی مزیدار پکچر تھی ایک سرے سے کھرا بری پکچر دیکھ آیا۔ مگر امّی نے یہ کہہ کر اچھے بھائی کو رستہ بتا دیا۔

"امتحان سر پر اور پکچر دیکھیں گے — ہونہہ۔"

اس وقت تو اچھے بھائی منہ سے کچھ نہ بولے مگر دل میں بہت جھنجھلائے میں تو ان کی خاموشی دیکھ کر تبھی بھانپ گئی تھی کہ جناب کچھ نہ کچھ تو ضرور گل کھلائیں گے۔

اور ویسا ہی ہوا۔

ڈپٹی صاحب سے ڈیڈی کی بڑی گہری دوستی تھی اور ان کی بیگم صاحبہ سے امّی کی آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ امّی کبھی تو ہم بچوں کو نہ لے جاتیں ہمیشہ ٹال جاتیں ایک بار ڈمپی کی سالگرہ پارٹی تھی۔ ڈپٹین صاحبہ نے (جنھیں ہم سب آنٹی کہتے تھے :) سبھوں کو اور خصوصیت سے بچوں کو بلایا۔ ایسے میں یہ ناممکن تھا کہ امّی یا ڈیڈی کسی قسم کا بہانہ بنا سکتے مجبوراً سالوں کو ہی سمیٹنا پڑا۔

(پارٹی تو دوسرے دن تھی) اس دن رات کو سونے سے قبل اچھے بھائی میرے

"میری اچھی بہن میری ایک بات مانے گی۔"

میرے پوچھنے پر انہوں نے اس قدر خطرناک تجویز میرے سامنے رکھی کہ مجھے اپنی پیٹھ پر تڑاتڑ جوتے برستے محسوس ہونے لگے۔ میں ناں ناں کرتی رہی مگر انھوں نے بہت پیار سے مجھے راضی کر ہی لیا۔

دوسرے دن ہم نے آنٹی کے ہاں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سب نے اپنے بہترین کپڑے پہنے، اچھے بھائی نے انتہائی سفید پینٹ اور سفید ہی قمیض پہنی، سب بچے تیار ہو گئے تو ڈیڈی نے فون کر دیا۔ آنٹی کا شوفر گاڑی لیکر آ گیا اور ہم آنٹی کے ہاں پہنچ گئے۔

آنٹی پورچ تک ہمیں لینے آئیں اور اندر بڑے سے ڈرائینگ روم میں لے گئیں۔ نرم نرم صوفوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔ "تشریف رکھیئے۔"

سب تو صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مگر میں اور اچھے بھائی بڑی شرافت سے نیچے جوتوں کے پاس بیٹھ گئے۔ آنٹی نے ہم دونوں کو یوں نیچا آسن جماتے دیکھا تو ہائیں ہائیں کرتی لپکیں۔

"ارے رے یہ نیچے کیوں بیٹھ گئے ــــ؟"

اچھے بھائی بڑی معصومیت سے بولے "جی ہم تو اپنے ہاں نیچے ہی بیٹھتے ہیں"

"ہائیں" وہ چیخیں "بھئی کئی بار تمہارے ہاں آ چکی ہوں میں تو ہمیشہ صوفوں پر بیٹھی"

اچھے بھائی بلا کسی جھجک کے بولے "جی وہ تو امی نے صرف مہمانوں کے لئے لگا رکھے ہیں۔ ہمیں تو صوفوں پر بیٹھنا آتا بھی نہیں" تائید کے لئے انہوں نے

میری طرف دیکھا۔ جیسے پوچھتے ہوں "کیوں بلّو ۔۔ ؟"
میں نے معصوم کی شکل بنا کر جواب دیا "جی ہاں۔"

سب کی اور امی کی صورتیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ امی حیران کہ کہیں اچھے بھائی پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں؟ آنٹی نے بازو سے انھیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ " اچھا اچھا۔ دوسروں کے ہاں جا کر تو صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔" اور انھیں اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ امی اس وار سے تو بالکل ہی کٹ کر رہ گئیں۔ مگر کر بھی کیا سکتی تھیں۔

پھر کھانے پینے کی چہل پہل ہونے لگی۔ ایک بڑی سی میز کے گرد کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور خوب ساری مٹھائیاں پھل پھول سجے ہوئے تھے۔ بیچ میں سفید سفید موم بتیاں دھری ہوئی تھیں۔ جب سالگرہ کی رسم ادا کی جانے لگی تو اچھے بھائی اچک اچک کر موم بتیوں کو دیکھنے لگے۔

امی نے دھونس بتائی۔ " اچھے تم نے کبھی موم بتیاں نہیں دیکھی تھیں جو یوں اچک رہے ہو۔"

وہ جواباً بڑی سنجیدگی سے بولے۔ " یہ باتیں تو میں عمر میں پہلی مرتبہ آج ہی دیکھ رہا ہوں۔"
امی اکدم سن ہی رہ گئیں، کیونکہ آنٹی انھیں کی طرف دیکھ رہی تھیں کرتیں بھی کیا؟

چائے کی میز پر اچھے بھائی نے وہ گرم بازاری کی ہے کہ بس اللہ یاد آ گیا۔ کبھی کیک ہاتھ میں اٹھا کر پوچھتے یہ کیا چیز ہے۔ تو کبھی پیسٹری کو مونہہ میں دبا کر بولتے۔ " ارے یہ کیسی مٹھائی ہے۔ اس کا نام کیا ہے۔" کبھی سنگتروں کو

چھلکوں سمیت کھانا شروع کر دیا تو کبھی سیب مع بیجوں کے نوش فرما گئے۔ امّی نے بے بس ہو کر ڈانٹا تو پھر وہی جواب۔ "تو پھر مجھے صحیح طریقہ بتلایئے نا۔ میں تو آج ہی کھا رہا ہوں یہ سب چیزیں۔"

کھانے کی میز پر بیٹھنے لگے تو سب سے پہلی حرکت اچھے بھائی نے یہ کی کہ جھٹ سے پتلون میں سے اپنی قمیض کھینچی اور اسے بطور نیپکن اپنی گود میں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ آنٹی لپکی ہوئی آئیں۔ "ہائے ہائے یہ قمیض کیوں بچھا ڈالی نیپکن کی طرح۔" یہ بڑے اطمینان سے بولے۔ "امّی نے ایسا ہی سکھایا ہے۔ نیپکن تو بھئی ہال ہوتی ہی نہیں۔" امّی بے چاری یہ دار بھی بے بسی سے سہہ گئیں۔ جب کھانا سرو ہونے لگا اور سب سے پہلے سوپ آیا تو اچھے بھائی بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں پانی گلاس سے پیا کرتا ہوں۔ یہ رکابی میں پانی کیسا اور پھر اتنا گندہ؟ پیلا پیلا سا۔ نہ بھئی میں تو کبھی نہ پیوں۔" ادھر مجبوراً اچھے بھائی کا اشارہ پا کر میں بھی کہہ رہی تھی۔ "بھئی ہم پانی پہلے پی لیں گے تو کھانا کیا خاک کھایا جائے گا۔"

امّی نے بے بسی سے مجھے اور اچھے بھائی کو گھبرا گھبرا کر دیکھنا شروع کیا مگر وہاں کون ان کا نوٹس لینے چلا تھا۔ آنٹی کے سمجھانے پر ہم دونوں سوپ پینے پر راضی ہوئے تو اس شان کے ساتھ کہ بجائے چمچوں کے پلیٹیں ہی مونہہ سے لگا ڈالیں، کھانا انتہائی بدتمیزی سے، کبھی چھری کانٹے سے، اور کبھی ہاتھوں سے کھایا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھلوانے کا مرحلہ درپیش ہوا تو اچھے بھائی نے (اور

ساتھ ہی مجھ بد نصیب نے) یہ کہہ کر اپنے چکنے ہاتھ قمیضوں کے دامنوں سے پونچھ ڈالے کہ " امی کہتی ہیں کہ صابن کا فضول خرچہ نہیں ہونا چاہیئے۔" اچھے بھائی کی سفید چکنی قمیض پر رنگ برنگی دھبے لہرانے لگے۔ اور میری ریشمی فراک سدا کے لیئے برباد ہوگئی۔

کھانے کے بعد پانوں کا دور چلا تو سب سے پہلے تھالی پر ٹوٹنے والے میں اور اچھے بھائی تھے۔ ہم دونوں نے بیک وقت دو دو تین تین پان مونہہ میں اور کچھ ہاتھوں میں بھر لیئے۔ آنٹی نے ناگواری سے ہمیں دیکھا تو اچھے بھائی لپا لپ کرتے ہوئے بولے۔

" ہماری امی کہتی ہیں بچّوں کو پان ضرور کھانے چاہئیں۔ دانت مضبوط ہوتے ہیں۔"

امّی نے دانت کچکچا کر انھیں دیکھا مگر وہ جبڑے چلانے میں بُری طرح مصروف تھے۔

جب گھر سے چلے تھے تو ہم لوگ اتنے پیارے، اتنے صاف ستھرے، اتنے سمجھدار نظر آرہے تھے کہ پوچھئے نہیں۔ اور اب ہماری یہ ہیئت تھی کہ کپڑے انتہائی گندے، مونہہ پان سے لال۔ پان کی پیک کے دھبّے کچھ ٹھوڑیوں پر اور کچھ اِدھر اُدھر ہوتے ہوئے ہمارے ہاتھوں اور پیروں کو بھی باغ و بہار بنا چکے تھے۔ واپسی کے لیئے جب ہم بڑے بڑے کمروں سے گذرنے لگے تو ایک کمرے میں بھُوسا بھرا ہوا بالکل ویسا ہی شیر رکھا ہوا تھا جیسا کہ ہمارے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ مگر یہاں وہ شیر دیکھتے ہی اچھے بھائی اکرم لڑکھڑا کر بھاگے اور آنٹی سے لپٹ پڑے۔ " شش۔ ششش۔ شیر۔"

آنٹی ہنسنے ہنسنے بے حال ہوگئیں اور سمجھا کر بولیں" نہیں بیٹے وہ تو جھوٹ موٹ کا نقلی شیر ہے۔"

امّی تقریباً لال پڑ کر بولیں" اپنے مردانہ ڈرائنگ روم میں کبھی تم نے شیر نہیں دیکھا؟"

اچھے بھائی بڑی سادگی سے بولے" مردانہ ڈرائنگ روم میں تو ہمیشہ نانا میاں بیٹھے رہتے ہیں۔"

آنٹی اس بات پر اس بُری طرح ہنسی ہیں کہ ہچکولے کھا گئیں۔ لگتا تھا امّی ابھی ابھی رو پڑیں گی۔ مگر کچھ بھی تو نہ کہہ سکیں ہائے بے چاری۔

چلتے چلتے جب آخری کمرے تک پہونچے اور باہر نکلنے ہی والے تھے کہ اچھے بھائی نے بڑے مزے سے، لہراتے ہوئے ریشمی پھولدار پردے سے اپنے جوتے صاف کرنے شروع کر دیئے۔ (اور ساتھ ہی مجھ بدنصیب نے بھی) امّی نے بوکھلا کر منع کیا تو ڈھٹائی سے بولے۔

"ہم تو اپنے گھروں میں پردوں سے ہی جوتے صاف کرتے ہیں۔" اب ڈرامہ ختم ہو چکا تھا اور ہم موٹر تک جا رہے تھے۔ چلتے وقت عام طور سے جیسی باتیں شروع ہو جایا کرتی ہیں ایسی ہی باتیں امّی اور آنٹی میں شروع ہوگئیں آنٹی نے پوچھا" بہن تم نے وہ پکچر دیکھی؟"

بجائے امّی کے اچھے بھائی نے جواب دیا۔" جی ہاں آنٹی امّی نے تو دیکھی ہی دیکھی، سارے گھر کو بھی دکھائی، سوائے ہم دونوں کے (طنز سے ہنس کر) مگر آج آپ کے ہاں آکر پکچر نہ جانے کا سارا غم غلط ہو گیا۔"

امّی نے ایک دم چونک کر اچھّے بھائی کو دیکھا۔ ایسا لگا جیسے ایک ہی لمحے میں ساری باتیں ان کی سمجھ میں آگئی ہوں۔ "ہوں تو یہ ساری سزائیں جو آج مجھے دی گئیں اسی لئے تھیں؟ اچھا اب سمجھوں گی تم سے۔" ان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ یہی کچھ سوچ رہی ہیں۔ موٹر چلنے ہی کو تھی کہ آنٹی نے بڑی جلی بھنی آواز میں امّی سے پوچھا۔ "آپکے اپنے بیٹے کا نام "اچھے" ہے؟"

امّی پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تلملا کر بولیں "جی ہاں یہی اچھے ہیں۔ بلکہ بہت اچھے ہیں؟" اور اچھے بھیا کو اس بری طرح گھورا کہ اگر وہ ذرا بھی نازک ہوتے تو وہیں موٹر کے اندر ہی جل کر راکھ ہو جاتے۔ مگر اچھے بھائی تو وہ مضبوط آدمی تھے کہ سگا ہوں کی مار تو کیا، ڈنڈوں کی مار سے بھی نہ مرے، امّی ہر ہر بات کو دہراتی جاتیں اور بات پیچھے ڈنڈا کمر پر برساتی جاتیں۔ (اور مجھ بدنصیب کو بھی)

دوسرے دن ہم دونوں اپنی اپنی مسہریوں میں پڑے ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھے جا رہے تھے "کیا حال ہے اچھے بھائی؟" میں نے کراہ کر پوچھا۔

"زندہ ہوں" وہ جیسے قبر میں سے بولے۔

اچھے بھائی کی پیشانی پر پہلی کے چاند ایسا اور میری کلائی پر جو یہ چودھویں کے چاند ایسا زخم کا داغ ہے وہ اسی یادگار دن کی بدولت ہے۔ مگر ایک بات تو ہے کہ پھر اس دن کے بعد سے کبھی امی ہمیں چھوڑ کر سکیچر نہیں گئیں۔

"جناب یہ بڑے آخر سمجھتے ہیں کیا ہے؟" یا ہم چاہیں تو اچھے اچھوں کو ناکوں چنے، چنے کیا پہاڑ تک چبوا کر رکھ دیں! جی ہاں ــــ!" یہ میرے اچھّے بھائی کا نعرہ ہے ــــ!

پچھتاوا!

عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ جب باپ کا انتقال ہو جاتا ہے تو اولاد کے لئے زندگی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارا حال ساری دنیا سے الگ تھا۔ میرے ببّا لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ امّی جب تک زندہ رہیں ہم سب بہنیں اتنی چھوٹی تھیں کہ بات کرنی بھی نہ آتی تھی۔ اسکول جوائن کرنے کا سوال ہی نہ اُٹھتا تھا۔ مگر امّی کی موت کے بعد جب اسکول میں داخل کروانے کی عمر ہوئی تو ببّا نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی ایک بھی بٹیا کو اسکول نہ بھجوائیں گے۔ قسمت نے ہمارے ساتھ ہر زیادتی روا رکھی تھی۔ امّی کی موت کے دو سال بعد ببّا بھی ہم آٹھ بہن بھائیوں کو چھوڑ کر چلتے بنے۔ اُس وقت میری عمر تین سال تھی اور میں نے ابھی ابھی بات کرنی سیکھی تھی۔ امّی، ببّا کے بعد ہم بہن بھائیوں کی تعلیم و تربیت کا بار تمام تر نانی اماں پر آ پڑا۔ وہ گاؤں کی رہنے والی تھیں مگر ہم لوگوں کی خاطر اپنی جاگیریں چھوڑ کر شہر (امراوتی) آ بسی تھیں۔ خود پڑھی لکھی نہ تھیں۔ مگر تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتی تھیں انھوں نے لوگوں کی مخالفتوں کے باوجود بھی ہم تینوں بہنوں کو اسکول میں داخل کروا دیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء تک ہماری تعلیم بڑی باقاعدگی سے ہوتی رہی۔ پھر ملک تقسیم ہوا

اور ہم لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ یہ الگ داستان ہے کہ ہم کس طرح حیدر آباد آئے اور کن کن کٹھنائیوں سے دوچار ہوئے۔ مجھے تو اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ سنانا ہے۔ یہاں میرا مقصد اپنے ماضی اور اپنی غربت کا رونا رونے سے نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس وقت جو واقعہ لکھنے بیٹھی ہوں اس میں غریبی کا ذکر اپنے آپ چلا آیا ہے۔

حیدر آباد آکر ہم بہنیں سٹی گرلز ہائی اسکول میں داخل ہو گئیں۔ چھوٹی بہنیں افروز بہت چھوٹی تھی اس لئے بچپن ہی سے اس کی تربیت کا ذمہ میری نانی اماں کی چھوٹی بہن نے لے لیا تھا۔ بہرحال ہم تینوں بڑی بہنیں یہاں پڑھنے لگیں۔ گھر چھوڑنے میں ہمارا بہت خسارہ ہوا تھا۔ اور حالت جو پہلے ہی تباہ تھی اور بھی تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کا مسئلہ بھی ناممکن سا معلوم ہونے لگا تھا۔ ایسے میں تعلیم تو ظاہر ہے ذیلی چیز بن جاتی ہے۔ مگر نانی اماں نہیں چاہتی تھیں کہ ہماری تعلیم ادھوری رہ جائے۔ اور لوگ کہیں "نانی خود جاہل تھیں، بیٹی کی اولاد کو بھی جاہل رکھا" اس طعنے سے بچنے کی خاطر نانی اماں نے جو جو مصیبتیں جھیلی ہیں وہ مجھے خون رلوانے کیلئے کافی ہیں!!

ہونے کو اسکول میں داخل ہو تو گئے، مگر دلوں پر جو گزرتی تھی خدا ہی جانتا تھا، یا پھر ہمارے اپنے دل۔ میں کچھ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئی ہوں اپنی آنکھوں پر مجھے بارہا جھرنوں کا گمان ہوتا ہے، جو بہے ہی جاتے ہیں۔ میں شاید کبھی نہ لکھ سکوں کہ ان دنوں یہ جھرنے کس قدر روانی سے بہتے تھے۔

یہاں اسکول میں ذہین لڑکیوں کی فیس معاف کردی جاتی تھی اور وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اگر کسی گھر سے تین چار بہنیں ایک ساتھ بس میں آیا کرتیں تو ایک بہن کا بس کا کرایہ بھی معاف ہو جاتا تھا۔ ذہین ہونے کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میری فیس معاف ہوگئی تھی۔ اس سے کچھ سہولت ہوگئی۔ مگر بس کا کرایہ کم نہ کیا گیا۔ حالانکہ ہم تین بہنیں ایک ساتھ آیا کرتی تھیں۔

یہ پتہ نہ چلا کہ کرایہ کس وجہ سے کم نہ ہوا تھا۔ غالباً اسکول کے مصارف کچھ بڑھ گئے تھے اور طالبات کی یہ سہولت ختم کردی گئی تھی۔

جس زمانے میں ہم اسکول جاتے تھے جغرافیہ پڑھانے والی ایک ٹیچر تھیں۔ خدیجہ آپا — یوں ان کی اصل کلاس تو جغرافیہ ہوتی تھی مگر وہ اردو تواریخ بھی پڑھایا کرتی تھیں۔ میری اردو ساری لڑکیوں سے اچھی اور خوبصورت ہوا کرتی تھی (خدیجہ آپا کے الفاظ میں) وہ مجھے اور میری بہنوں کو بہت چاہتی تھیں اُن کی یہ بات میں سمجھتی ہوں بجا بھی تھی۔ کیونکہ جب ہم پہلے پہل اسکول میں داخل ہوئے تھے — تو "مہاجرین" کہہ کر ہمارا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ہم پر طعنے کسے جاتے تھے۔ اور لڑکیاں یہ کہتی تھیں کہ ان مہاجروں کی وجہ سے دیکھ لینا اب کے اپنی کلاس کا رزلٹ بہت گر جائے گا۔ پتہ نہیں ان کی اس بات میں کہاں تک سچائی تھی۔ مگر ہوا یوں کہ جب نویں کلاس کا امتحان ہوا اور نتیجے کی رپورٹ ملی تو خدیجہ آپا نے ٹیبل کے پاس کھڑے کھڑے کہا تھا۔

"عام خیال تھا کہ مہاجرین لڑکیاں کلاس کے نام کو بٹہ لگا دیں گی۔ مگر بڑے

دُکھ کی بات ہے کہ اب کے سب سے اونچے مارکس ان مہاجرین لڑکیوں ہی کے ہیں۔"

خدیجہ آپا نے رپورٹ میرے ہاتھ میں دی تو میں نے دیکھا کہ میرے نمبر سب سے زیادہ تھے!

ظاہر ہے خدیجہ آپا کی چاہت بے جا نہ تھی۔ پھر ہمارے مجبور اور بے بس چہروں سے وہ یہ اندازہ بھی لگا چکی تھیں کہ ہماری حالت اچھی نہیں ہے اور اس بات پر وہ کڑھتی بھی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے ذرا رکتے رکتے کہا۔

"واجدہ، فی الحال تو اسکول کے مصارف زیادہ ہو جانے کی وجہ سے کرایے میں کمی نہیں ہو سک رہی ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہارا کرایہ اپنی طرف سے بھر دیا کروں۔"

مجھے ایسا لگا کہ گویا میں زمین کے اندر دھنس گئی ہوں۔ میں آپ سے بتاؤں۔ میرا باپ شہر کا سب سے بڑا وکیل تھا۔ جس نے فیس کے طور پہ سونے کی اینٹیں وصول کی تھیں۔ تین چار سالوں میں کئی لاکھ روپیہ کمایا تھا اور وہ سیّد تھا۔ نانی اماں پانچ گاؤں کی مالک تھیں۔ میری اماں جہیز میں ڈھیروں سونا لائی تھیں۔ میں اس وقت ساڑھے گیارہ برس کی تھی۔ مگر کس قدر سمجھدار، حسّاس اور غیور ـــــ حماقت کی حد تک!

میں نے کچھ غصّے اور حقارت سے خدیجہ آپا کو دیکھا۔ شاید وہ یہ نہیں سمجھتیں کہ میں کس قدر بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں۔ مجھے اک دم اپنی نانی اماں کا خیال

آیا۔ ایک بار میرے ماموں نے مجھے ایک پیسے کی برف کی گڑیا دلا دی تھی میں برف کی لال گڑیا ہاتھ میں لے گھر میں آئی تھی تو نانی اماں نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"یہ برف کہاں سے لائی۔؟"

میں نے جب ماموں کا نام بتایا تو نانی اماں جلتا شعلہ بن گئیں۔ انھوں نے برف کی گڑیا تو میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دی اور خود جوتی لے کر میری اتنی مرمت کی کہ کئی دنوں تک میری پیٹھ کے زخم مندمل نہ ہو سکے۔

"تجھے معلوم ہے کسی کا پیسہ نہیں لیا کرتے۔ تیرا باپ سید تھا تو اتنے بڑے گھرانے کی لڑکی۔ تجھے شرم نہیں آتی کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے۔؟"

میں نے آنسو روکتے ہوئے کہا تھا۔ "نانی اماں میں نے ان سے مانگا تھوڑی تھا۔ وہ تو انھوں نے خود ہی دیا تھا"

"تو نے لیا ہی کیوں۔؟" اور انھوں نے پھر سے پٹائی شروع کردی تھی۔

میں نے ایک دم زور سے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

"نہیں نہیں، ایسا آپ سوچئے بھی نہیں" مجھے اچانک ہی اپنا سید ہونا اس قدر شدت سے یاد آیا کہ میں نے بڑی بے رخی سے انھیں ڈانٹ دیا۔

ان کا چہرہ ذرا سا ہو کر رہ گیا۔ مگر جلد ہی خود کو سنبھال کر بولیں۔

"مجھے تمھارا دل دکھانا نہیں ہے واجدہ۔ میں تو آگے بڑھتے ڈرتے کہا تھا" بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلا مہینہ آیا تو فیس کی آخری تاریخ [illegible] ہماری جیب [illegible] بھی وصول

کیا کرتی تھیں۔ سب لڑکیوں نے اپنی اپنی فیسیں بھر دیں مگر ہماری فیس رہ گئی۔

"تمھاری فیس ۔۔ ؟" ایک دن خدیجہ آپا نے کلاس سے جاتے جاتے پوچھا۔

"جی ۔۔ جی ۔۔" میں ہکلا کر رہ گئی۔ مگر آنسوؤں نے بات پوری کر دی۔

پھر دو ایک دن بعد گاؤں سے روپیہ آیا تو ہم نے خوشی خوشی اپنی فیس بھر دی۔ مگر ہمارے ساتھ یہ مشکل تھی کہ پیسہ جتنی تیزی سے آتا اسی تیزی سے ختم بھی ہو جاتا اور ہر ماہ پہلے سے بُری حالت ہو جاتی اور بس کا کرایہ الگ ڈراتا رہتا۔

ایک دن جب میں انٹرول میں نماز پڑھنے جا رہی تھی کہ گملوں کے پاس سے گزرتے گزرتے ایک دم خدیجہ آپا نے روک لیا۔ ان کے چہرے پر خوشی چمک رہی تھی۔

"ارے واجدہ سنو ۔۔ اب تمہارا بس کا کرایہ معاف ہو جائے گا۔"

میں نے خوشی سے اُن کی طرف دیکھا ۔ "سچ ۔۔ ؟"

"ہاں ۔" وہ بازو سے کاغذات نکالتے ہوئے بولیں۔ "آج ہی یہ کاغذات ہمیں ملے ہیں۔ ذہین لڑکیوں کا کرایہ معاف کر دیا گیا ہے۔"

بس کا کرایہ آدھوں آدھ کم ہو گیا۔ اس طرح ہمیں بہت آسانی ہو گئی۔ اب اسکول آتے شرم نہ آتی تھی۔ اور غریبی کا احساس جی کو چھوکے نہ دیتا تھا۔

ہم اطمینان سے پڑھتے رہے اسکول جاتے رہے۔ اب فیس ہوّا بن کر نہ ڈراتی تھی۔ اور بس کا کرایہ دیتے رونا نہ آتا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے خدیجہ آپا

کی ہمّت نہ پڑی تھی کہ پیسوں کے متعلق مجھ سے کسی قسم کی بات کرتیں۔ اسی لئے میرا دل خدیجہ آپا کی عزت پہلے سے دو دنی کرنے لگا تھا۔ کہ وہ اتنی بڑی ہو کر میری استاد ہو کر بھی، کس نرمی سے میری بات مان گئی تھیں۔ اور ذرا تو خفا نہ ہوئیں۔!

پھر ایک دن خدیجہ آپا نے دکھی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ ان کا تبادلہ کسی اور اسکول میں ہو گیا ہے۔ اور لڑکیوں کے دل کا حال مجھے نہیں معلوم مگر مجھے اس خبر سے بڑا دکھ ہوا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی ٹیچر تھیں بلکہ ایک شفیق اور مہربان ہستی بھی تھیں جن کی بزرگی میں دوستی کی جھلک بھی ملتی تھی۔

خدیجہ آپا چلی گئیں۔ ان کی جگہ دوسری ٹیچر خورشید آپا آ گئیں اب ہیڈ مسٹریس کی ادلا بدلی ہو گئی اور اس طرح اردو ہیڈ مسٹریس کے نصیب میں گئی۔ اور فیس بھی وہی وصول کرنے لگیں۔

خدیجہ آپا کے بعد جب پہلی بار فیس اور کرائے کی بات نکلی تو ہیڈ مسٹریس نے کہا۔

"تم نے اب تک اپنا بس کا کرایہ نہیں دیا ہے۔ یاد ہے"

میں اپنی سیٹ پر کھڑے ہو کر بولی۔

کرایہ — کیسا کرایہ — میرا کرایہ تو معاف کر دیا گیا ہے۔ میں نے ادھر پچھلے کئی مہینوں سے کرایہ نہیں دیا ہے"

ہیڈ مسٹریس نے کچھ حیرت سے اور کچھ الجھن سے میری طرف دیکھا۔ پھر خاموش رہ گئیں۔

اس واقعہ کو کتنے دن گزر گئے؟ میں نویں سے نکل بھی گئی۔ بی اے ہو گئی۔

ایم اے کی تیاری کرنے لگی۔ کبھی خدیجہ آپا سے ملنا نہ ہوا۔ ایک بار نمائش میں وہ ملیں۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتی ان کے پاس گئی۔ سوچا تھا کہ ان سے بہت کچھ کہوں گی۔ ان کے سامنے عقیدت سے سر جھکا دوں گی۔ اپنی گستاخیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگوں گی کہ میں آپ کو کیا سمجھتی تھی۔ اور آپ کس قدر عظیم ــــ کتنی اونچی نکلیں ــــ مگر جب میں ان کے قریب پہنچی تو وہ گھبرا سی گئیں۔ شاید انھوں نے سوچا ہو کہ اب جب کہ ان کی چوری کھل گئی ہے۔ میں ان کو للکارنے آگئی ہوں۔

میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے مسکرا کر، کچھ گھبرا کر کہا "اچھی تو ہو" پھر ایک دم اپنی ساتھی سے مڑ کر بولیں۔

"جلدی چلو رات ہو رہی ہے۔"

میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے کترا رہی ہیں۔ پہلو بچا رہی ہیں۔ انھوں نے مجھے خدا حافظ کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئیں۔ میرے دل سا سارا درد میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اور میری آنکھیں جھر جھر برسنے لگیں۔

آسمان کے رنگ

آج فرحاں کی سالگرہ تھی۔

بڑے باپ کا بیٹا ـــ اور وہ بھی اکلوتا ـــ یہ موقع سال میں ایک بار ہی تو آتا تھا۔ اس دن ابا حضور بچّوں سے بڑھ کر بچّہ بن جاتے۔ آفس کو اس دن گولی مار دیتے۔ صبح سے وہ شور مچاتے کہ بچّے ان کے سامنے مات کھا جاتے۔ ان کی لمبی سی پتلی مچھلی جیسی کار مارکیٹ کے ہزاروں پھیرے کئے جاتی۔ مگر اُن کی تسلّی نہ ہوتی۔

باہر لان میں سویرے سے ہی لاؤڈ اسپیکر لگا دیا جاتا۔ انگلش میوزک سے لے کر، ہندوستانی موسیقی، فلمی گانے، قوالیاں کان پھاڑے ڈالتیں۔ ادھر کوٹھی کے اندر بڑے والے ہال میں زور زور سے ریڈیو گرام پر ریکارڈ بج رہے ہوتے ـــ اسی پر بس نہ ہوتا بلکہ دوست احباب کے بچّوں کے علاوہ پاس پڑوس کے سارے ہی بچّے صبح سے ہی بلا لئے جاتے، بے سُری آوازوں میں وہ دنیا بھر کے گیت گاتے۔ چیختے چلّاتے، دھومیں مچاتے اور ابا حضور دیکھ دیکھ کر خوش ہوئے جاتے۔

"چار لڑکیوں میں ایک ہی تو لڑکا اللہ نے دیا ہے اس کی سالگرہ پر بھی شور شرابہ نہ ہو تو پتہ کیسے چلے کہ اس کی سالگرہ کا جشن ہے۔"

جس کی سالگرہ ہو اسے تحفے ملنا تو عام سی بات ہے۔ ابا حضور کے چاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ سالگرہ پارٹی میں آنے والے ہر بچے کو تحفوں سے لاد دیتے ۔۔۔ کھلونوں کی ایک دکان سی کھل جاتی۔ اپنی اپنی پسند کے کھلونے سمیٹے بچے اس قدر شور مچاتے، ہنستے، چیختے چلاتے کہ کان پھٹ ہونے کی نوبت آجاتی۔

شمو کے لیے یہ سب کچھ بڑا عجیب، نیا اور غیر یقینی سا تھا نو دس سال کی بھولی بھالی ہیناسی بچی ۔۔۔ بچپن میں ہی جب ماں اور باپ دونوں ہی ہی چھوڑ کر چلے جائیں تو ویسے ہی دنیا بڑی اجنبی سی جگہ لگنے لگتی ہے۔ اور پھر وہ تو گاؤں سے اٹھا کر اک دم سے ایسے ماحول میں پہنچا دی گئی، جو کہانیوں کے دیش سے بھی سوا تھا ۔۔۔ ابھی چند روز پہلے چھٹیوں میں جب امی بی بی گاؤں گئیں تو وہاں شمو پر نظر پڑ گئی ۔۔۔ حویلی کے ایک کونے میں پکے صحن کے نل کے نیچے بیٹھی اپنے چھوٹے چھوٹے کمزور ہاتھوں سے گھر بھر کے میلے کپڑوں کا ڈھیر دھو رہی تھی۔ بڑی بڑی چادریں، تولیے اس سے ٹھیک سے نچوڑے بھی نہ جا رہے تھے۔ امی بی بی کسی کمرے سے نکل کر پچھواڑے گئیں تو وہ بڑی اپنائیت سے بولی۔

"بی بی جی آپ کے بھی کوئی کپڑے دھونے ہوں تو دے دیجئے ۔۔۔"

امی بی بی کو بے پناہ ترس آگیا ۔۔۔

"تمھاری ننھی سی جان دیکھو اور یہ کپڑوں کا انبار! اور ابھی دھونے کی ہوس باقی ہے؟"

وہ بڑے غم ناک انداز میں مسکرا کر بولی "کام نہیں کرونگی تو کھانے کو کون پوچھے گا؟"

"کیوں تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟"

"اونہوں ۔۔۔" اس نے دکھ سے کہا۔ "جب بہت چھوٹی سی تھی تبھی مر گئے تھے ۔۔۔ دونوں ہی۔"

امی بی بی نے اور کچھ نہیں پوچھا ۔۔۔ پوچھ کر فائدہ بھی کیا تھا ۔۔۔ خدا کی دنیا میں کتنے لوگ غموں سے چُور پڑے ہیں ۔۔۔ پوچھ کر اُسے دُکھ ہی تو دینا تھا ۔۔۔ بس انھوں نے یہ کیا کہ واپسی میں اُسے اپنے ساتھ گھر لے آئیں۔

"بڑے سرکار دل والے تو تھے ہی ۔۔۔ کتنے سارے نوکر اور اُن نوکروں کے بچّے بھرے پڑے تھے، یہ ایک اور سہی، کم سے کم پڑھ لکھ تو لے گی۔"

شہر کی جگمگاہٹ، گاؤں کے مقابل ہزار گنا زیادہ کھانا اور بچیوں کے اترن کپڑوں کی بے پناہ خوشیوں سے ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ فرحان میاں کی سالگرہ کے جشن نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

پورے گھر کو (جسے وہ اپنی گاؤں زدہ جاہلیت کی وجہ سے گھر کہتی تھی ۔۔۔ جو تھی دراصل شاندار کوٹھی) بے پناہ پھولوں، غباروں اور چمکدار پنی کے رنگین کاغذوں سے سجایا گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر چیخ رہا تھا ۔۔۔ اندر ریکارڈ بج رہے تھے۔ بچّے خود بھی چیخ چلّا رہے تھے اور غباروں کو ایک دوسرے سے رگڑ کر بے پناہ شور پیدا کر رہے تھے ۔۔۔ ابا حضور نے تحفوں میں

بے حساب پینپیاں بانٹی تھیں، کئی بچّے "چور سپاہی" کا کھیل کھیل کر تیز تیز سیٹیاں بجا رہے تھے۔ اُدھر کچن میں بے حساب پکوان پک رہے تھے اور برتنوں کا شور سارے شور کو دگنا تگنا کئے دے رہا تھا ـــــ شور کا یہ عالم تھا کہ باہر سے کوئی نوکر کسی کام کے لئے دوسرے نوکر کو پکارتا تو اُسے چیخوں میں پکارنا پڑتا۔

شمّو ایک حیرت انگیز مسرّت سے یہ ناقابل یقین تماشہ دیکھتی پوری کوٹھی میں گھوم رہی تھی۔ اس کے سرخ سرخ گال خوشی سے تمتما رہے تھے، کالی کالی معصوم آنکھیں ہیروں کی طرح دمک رہی تھیں ـــــ کبھی کبھار، آپ ہی آپ وہ ہنس دیتی تو اس کے خوب صورت دانت موتیوں کی طرح چمک اُٹھتے۔

بے پناہ گھنے بال اُس کے کندھوں پر آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ اور فرحان کی سب سے چھوٹی بہن شینی کی ایک اترن فراک میں بلاشبہہ وہ محفل کی سب سے حسین گڑیا سی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کا ڈرا ہوا، سہما ہوا لیکن ماحول کی خوبصورتی سے حوصلہ پایا ہوا تجسّس اُسے کشاں کشاں تحفوں کی عظیم الشان میز کے پاس لے گیا جہاں ایسے ایسے تحفے سجے ہوئے تھے کہ زندگی میں کبھی اس نے خوابوں میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔

لمبی سی میز کو ایک سرے سے دیکھتی ہوئی وہ جانے کتنی دیر میں دوسرے سرے تک پہنچی۔ کونے میں ایک چھوٹا سا پیانو رکھا ہوا تھا۔ اس نے آج تک پیانو نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے غور سے اسے جھک کر دیکھنے لگی ـــ کچھ سمجھ میں نہ آیا

یہ کیا شے ہو سکتی ہے ـــ ایک بالشت چوڑا دو بالشت لمبا ـــ یہ کیا ہو سکتا ہے ـــ؟
اس نے انگلی سے ذرا سا چھو کر دیکھا دھن سے ایک پیاری سی آواز نکلی۔ جو اتنے بڑے غل غپاڑے اور شور شرابے میں جلنے کدھر دب کر رہ گئی ـــ اس نے دوبارہ سے انگلی دبائی ـــ پھر ایک بار اور ـــ پھر ایک بار اور ـــ

اتنے شور میں تو آواز اچھی طرح اس کے کانوں تک پہنچ بھی نہیں پا رہی تھی اس نے اب کے ذرا زور لگا کر انگلی دبائی ـــ ایک خوب صورت سُر بے پناہ شور میں ڈوب گیا

اب کے اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ایک ساتھ پیانو کو دبایا۔
ـــ اور ادھر چٹاخ سے ایک زور دار تھپڑ اس کے نرم نازک گال پر پڑا۔

"کُتیا کہیں کی ـــ شرم نہیں آتی اتنا شور کرتے ہوئے؟"

اس نے گھبرا کر سر اٹھایا ـــ ابّا حضور غصّہ میں سرخ ہو رہے تھے۔

اُدھر کئی بچّوں نے مل کر ایک کورس گانا شروع کر دیا تھا ـــ
آسمان کے کتنے رنگ ہوتے ہیں ـــ!
آسمان جو مہربان ہے ـــ کبھی ہرا ہے۔ کبھی نیلا۔ کبھی گلابی ـــ کبھی قرمزی۔
آسمان کے کتنے رنگ ہوتے ہیں۔
آسمان جو باغ ہے ـــ کبھی پھولوں کی طرح گلابی ہے، ندیوں کی طرح نیلا۔
جو بہاروں میں بنفشئی ہے تو برسات میں۔

شمّو نے اپنی سسکی روک کر گانے والے بچوں کی طرف دیکھا۔

"میری پوچھو تو کہوں ـــ آسمان کا رنگ ہر جگہ ایک ہے۔"

"گاؤں میں بھی شہر میں بھی۔"

لیکن وہ یہ بات اپنے ہونٹوں سے نہ نکال سکی غریبوں کا بات کرنا بھی تو شور مچانا ہی ہے نا!

تعارف

بدلہ ـــــ بدلہ ـــــ بدلہ ـــــ

ہم سب انتقام کی آگ میں بُری طرح جلے جا رہے تھے۔
بات کچھ بھی نہیں تھی جناب، اور دیکھا جائے تو بہت کچھ تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ صبح سے شام تک ہمارے ہاں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بھائی جان ٹھہرے ایم۔ اے کے طالب علم اور پپا کے چہیتے بڑے بیٹے! اس لئے وہ ڈرائنگ روم میں اکثر موجود رہتے اور ہمیشہ اُن کا تعارف زوردار لفظوں میں کرایا جاتا۔ "یہ ریاض احمد ہیں ـــ میرے بڑے بیٹے۔ اکنامکس سے ایم اے کر رہے ہیں۔ ویسے آرٹ سے لگاؤ ہے۔ کئی پینٹنگس پر انعام حاصل کر چکے ہیں۔"

ستم یہ ہوتا تھا کہ جیسے ہی معزز مہمان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہم سب بچوں کو فوراً وہاں سے بھگا دیا جاتا تاکہ کہیں کوئی بدتمیزی نہ کر بیٹھیں مزید ستم یہ کہ جب چائے کی پیالیاں کھنکھناتیں اور ممی کے ہاتھوں کے تیار کئے ہوئے ایک سے ایک لذیذ پکوان چائے کی میز کی زینت بنتے تو

بھائی جان مہمانوں کی خاطر کی آڑ میں سب سے زیادہ خود ہی ہر چیز کا صفایا کر دیتے۔ ویسے بھائی جان سے اس کھانے پینے کے معاملے میں زیادہ لڑائی نہ ہوتی کیوں کہ بعد میں ممّی ہم سب کو کچھ نہ کچھ تو پکڑا ہی دیتی تھیں۔ اصل غصہ تعارف پر تھا۔ اس لیئے کہ مہمانوں کے سامنے گل دستہ بنے دراصل بھائی جان مٹکتے رہتے تھے۔ جاتے جاتے ہر مہمان لازماً انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے جاتا۔ اور یوں بھائی جان نے پتہ نہیں کتنی دعوتیں ہضم کر لی تھیں۔ ہم لوگ سوچا کرتے کہ اگر مہمانوں کے سامنے ہمارا بھی ذرا سا تعارف ہو جائے تو کیا بُرائی ہے؟ کیا اپیا اس قدر اچھی سلائی نہیں کرتیں (اب ان کی عمر تیرہ سال ہے تو کیا ہوا؟) کیا منّے بھائی اتنی اچھی کہانیاں نہیں لکھتے؟ (اب اس میں شرم کی کون سی بات ہے کہ کسی ایڈیٹر نے آج تک انھیں چھاپنے کی ہمت نہیں کی ـــ بہرحال لکھتے تو ہیں!) کیا میں اس قدر اچھی تصویریں نہیں بناتی کہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی کی چُرالی ہیں (حالاں کہ حقیقت میں ایسا کبھی نہیں ہوا!)

مگر نہیں صاحب ـــ توبہ کیجئے تعارف تو دور رہا، ہم تو مہمانوں کے آتے ہی ڈھور ڈنگروں کی طرح فوراً وہاں سے ہانک دیئے جاتے ـــ اور پھر سارے دن وہاں بھائی جان ہی بھائی جان باجتے ـــ لازماً ہم سب بھائی جان کے دشمن بن کر رہ گئے۔ اور کیوں نہ بنتے؟ چلیئے، اگر یہ ہوتا کہ صرف پپّا ہی تعارف کراتے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔

وہاں تو یہ حال تھا کہ کسی دن اگر پپا کی غیر موجودگی میں مہمان آجاتے تو بھائی جان خود اپنی اکنامکس کی کتابیں اور سڑی بسی پینٹنگس کا پٹارہ لے کر وارد ہو جاتے اور جب تک زبردستی کی داد کسے ڈنگر سے نوچ نہ برسا لیتے (اور ایک آدھ دعوت نہ چپکا لیتے) وہاں سے نہ ٹلتے۔ اس لئے رہ رہ کر ہم سب کے سینے میں بس یہی آگ بھڑکی جا رہی تھی کہ کیسے بھائی جان سے بدلہ لیں۔

ہم تو جناب اس بات کے قائل ہیں کہ سو دن سنار کے تو ایک دن لوہار کا کبھی نہ کبھی تو اللہ میاں ہر دل کی دعا سنتے ہیں، ہماری بھی ایک دن انہوں نے سن لی۔

اُس دن ممّی اور پپّا دونوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بھائی جان کالج میں تھے۔ گھر پہ ہم بچے ہی بچے تھے۔ سُرخ سائیکل پہ سوار ایک پوسٹ مین آیا اور ایک ایکسپریس لفافہ پکڑا گیا۔ دستخط کر کے ہم نے خط لیا، اور اس اندیشے میں کہ کہیں کوئی پریشانی کی خبر نہ ہو، جلدی سے کھول کر پڑھ بھی لیا۔ خط پپّا کے نام تھا۔ بداخلاقی کی حرکت تو تھی، لیکن سوچا بُرا بھی کیا ہے۔ اپنے ہی پپّا کا خط تو ہے۔ پتہ چلا کہ شام کی گاڑی سے پپّا کے ایک دوست جو دماغی امراض کے ڈاکٹر ہیں، بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ — دوسرے دن روانہ ہو جائیں گے۔

اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ بھائی جان کالج سے آنے

ہی والے تھے۔ پپا اور ممی کا کچھ ٹھیک نہ تھا کہ کب آئیں۔ مشترکہ رائے سے خط کو فوراً چھپا دیا گیا، اور ہم سب نے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

جیسے ہی بھائی جان گھر میں داخل ہوئے پہلے تو ہم نے اُن سے یونیورسٹی کا تھوڑا سا احوال پوچھا، پھر اُن سے کہا کہ جلدی سے کھانا کھا لیں، ایک اہم مسئلے پر کچھ گفتگو کرنی ہے۔

اپنے بڑے پن اور اپنی قابلیت جتانے کا موقع تو اللہ بھائی جان کو دے! کھانا کھا کر فوراً ہمارے کمرے میں چلے آئے اور پوچھا، "اچھا بچو تم کیا پوچھ رہے تھے؟"

"کوئی خاص بات نہیں بھائی جان" اپیا بولیں۔ "یہاں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی کوئی انسان کب تک خاموش رہ سکتا ہے؟"

بھائی جان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی منّا کچھ ورغلانے کے سے انداز میں بولا۔ "دو منٹ بھی نہیں۔"

"ارے یار، کمال ہی کر دیا۔ یہ تو صرف اختیار کی بات ہے۔ دو منٹ کیا، انسان دو دن بھی خاموش رہ سکتا ہے۔"

"ناممکن!" ہم سب ایک ساتھ چلّائے۔

"اگر میں ممکن کر کے دکھا دوں تو؟"

"تو؟" اپیا بے حد ڈرامائی انداز میں بولیں۔ "تو جناب بھائی جان،

میں منّا اور شلّی اپنی پوری عیدی، جو کم سے کم سو روپے بنتی ہے، آپ کو انعام میں دے دیں گے۔"

بھائی جان کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ منہ میں آیا ہوا پانی نگلتے ہوئے بولے۔ "کیا کہا سو روپے! صرف دو دن خاموش رہنے کے لئے؟ ارے یار سو روپے کی خاطر تو میں ایک ہفتہ بھی خاموش رہ سکتا ہوں۔

"اچھا تو پھر طے!"

باری باری ہم تینوں نے ان سے ہاتھ ملائے اور یہ بات طے ہو گئی کہ کل رات کے نو بجے تک بھائی جان ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے اور اگر کچھ بھی بولے تو سو روپے والی شرط ایک دم ختم۔

بھائی جان غریب نے سو روپے کے لالچ میں فوراً خاموشی اختیار کر لی — اور ظاہر ہے، ہمیں ان پر سخت نگرانی رکھنی تھی کہ کہیں وہ کچھ بول نہ دیں۔ نوکر چائے کے لئے پوچھنے آیا۔ بھائی جان خاموش۔

مالی گلدستہ بدلنے آیا — بھائی جان جو روزانہ طرح طرح کی ہدایتیں پھولوں کے سلسلے میں دیا کرتے تھے، آج گم!

ہم سب بُری طرح خوش ہو رہے تھے کہ چلو بھائی جان اپنے امتحان میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر عیدی کے سو روپے چلے جائیں گے۔ ڈاکٹر چچا پر کچھ رعب بھی تو ہم ڈال سکیں گے۔

جیسے ہی شام ہوئی، ہم تینوں نے اپنے بہترین کپڑے پہنے اور پورچ میں

جاکر کھڑے ہو گئے۔ اب تک ڈاکٹر چچا کو ہم میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا لیکن یہ یقین تھا کہ تعارف نہ ہونے کے باوجود ہم انھیں پہچان ضرور لیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹیکسی آکر رُکی اور اس میں سے ایک بہت ہی شاندار شخصیت برآمد ہوئی۔ یقیناً وہی ڈاکٹر چچا تھے۔ کیونکہ ہر ڈاکٹر کی طرح ان کے ساتھ ایک بیگ لٹک رہا تھا۔

ہم تینوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اخلاق کے ناطے ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمیں نے ادا کیا۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔

"بھئی بچّو، تم لوگ بڑے مہمان نواز ہو۔ بڑے خوش نصیب ماں باپ ہیں تمھارے۔"

ہم لوگوں کی زندگی میں آج تک ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ کوئی ہمارے ہتّھے یوں چڑھا ہو! اس لئے ہم نے خود ہی اپنا اپنا تعارف کرایا۔

اپیا نے فرمایا۔ "جی میرا نام ریحانہ ہے۔ میں بے حد اچھی سِلائی کرتی ہوں۔ بے حد لذیذ پکوان پکاتی ہوں ـــــ ایسا کہ بعض مرتبہ لوگوں کو شک ہو جاتا ہے کہ کہیں ممّی نے نہ پکایا ہو!"

منّے بھائی کہنے لگے۔ "میں اُردو ادب میں کچھ اضافے کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ذرا کہانیاں لکھنے کی مشق کرتا رہتا ہوں۔"

ڈاکٹر چچا محبت سے مسکرائے اور بولے۔ "کہیں کوئی چیز چھپی بھی ہے؟"

"جی ـــــ" منّے بھائی بغیر کسی شرم کے بولے۔ "اب تک تو ایسا موقع نہیں

آیا ہے۔ اسی لئے سوچ رہا ہوں کہ خود ہی ایک پرچہ نکال لوں، جس میں صرف میری کہانیاں ہوں۔ بہرحال میں ہندوستان کو ایک اچھے ادیب سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔"

چچا قہقہہ مار کر ہنسے، مگر ہم لوگ سخت حیران تھے کہ تعارف کراتے وقت پپا کے دوستوں میں سے آج تک کوئی اس طرح نہیں ہنسا تھا، پھر آج چچا کیوں ہنس رہے ہیں؟ بہرحال وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

میں نے بہت مختصر الفاظ میں اپنا تعارف ویسا ہی کرایا جیسے پپا بھائی جان کا تعارف کراتے تھے۔ "جی میں شتلی کہلاتی ہوں۔ آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ملک کے کونے کونے میں میرا نام روشن ہو جائیگا۔۔۔"

ہم سب بے حد خوش ہو رہے تھے کہ آج اللہ نے برسوں کی مراد پوری کر دی۔ اور ہم خود ہی کھول کر اپنا تعارف کرا رہے تھے اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ بھائی جان اس محفل میں موجود نہیں تھے (اور جو ہوتے بھی تو کیا بول پاتے؟)

لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ چوری چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا، تو محفلوں کے رسیا ہمارے بھائی جان ڈرائنگ روم میں گڑبڑ دیکھ کر سیدھے ادھر ہی چلے آئے۔ چاکلیٹی پتلون گہرے مسٹرڈ رنگ کی ٹی شرٹ پہنے وہ اس وقت واقعی بے حد خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر چچا اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ ملا کر بڑے بشاش لہجے میں بولے، "آپ کی تعریف؟"

بھائی جان نے بڑی بے چارگی سے ہم تینوں کی طرف دیکھا۔ اپیا نے کہا۔ "جی یہ بیچارے بول نہیں سکتے۔"

"ہائیں؟" ڈاکٹر چچا پر حیرت اور صدمے کا سا حملہ ہوا۔ منے بھائی افسوس کے ساتھ بولے۔ "جی ہاں، بیچاری زبان گفتگو سے قاصر ہے۔" (وہ بہرحال ایک ادیب تھے اور گفتگو میں ادب کا پٹخ آنا لازمی تھا!)

لیکن چچا گڑبڑا کر بولے، "میں چند سال پہلے یہاں آیا تھا تو یہ اچھے خاصے تھے بھئی۔"

"جی ہاں چچا، جب اچھے تھے لیکن اب بگڑ گئے۔" بھائی جان نے گھور کر منے بھائی کو دیکھا۔ "اور سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے چچا جان کہ بیچاروں کی دماغی حالت بھی درست نہیں۔"

بھائی جان نے گھونسا بنا کر لہرایا، مگر زبان تو سو روپے میں رہن رکھ چکے تھے۔ چچا نے لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ان کی ڈاکٹری حس اُبھر آئی تھی۔

"یہ حالت کب سے ہے؟"

"ارے چچا" میں ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں یہی حالت دیکھ رہے ہیں۔"

چچا نے افسوس سے سر ہلایا اور پوچھا۔ "جی آگرہ بھیجا تھا انھیں؟"

"آگرہ؟ ارے چچا جان آگرہ، رانچی، ناگپور، جہاں جہاں جس نے کہا بھجوایا مگر یہ ہر بار بھاگ آتے ہیں۔"

چچا نے بے یقینی کے انداز میں ہماری طرف دیکھا، بولے: "ایسے کیسے بھاگ آتے ہیں؟ دماغی مریض تو ہمیشہ پہرے میں رکھے جاتے ہیں۔"

منّے بھائی گڑبڑا کر بولے۔ "مطلب یہ کہ مارے محبت کے ممّی اور پپّا ہی واپس بُلا لیتے ہیں۔"

چچا نے بے حد غم سے سر جھکا لیا ـــ پھر وہ سر اٹھا کر بڑے افسوس سے بھائی جان کو دیکھنے لگے۔ دھیرے سے بولے۔ "ایک باپ کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایسا جوان اور خوبصورت بیٹا ـــ مگر پاگل اور گونگا! خیر میں اس کے علاج کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ کیس اتنا بھی کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔" اچانک انھوں نے پوچھا۔ "بچّو تمہارے پپّا ممّی کب تک لوٹیں گے؟"

"جی کچھ ٹھیک نہیں ـــ وہ تین دن کے لئے پونا گئے تھے۔" لیکن اچانک پیچھے سے پپّا کی آواز آئی۔ "لو بھئی ہم آ ہی گئے..... ارے تم حامد ـــ ارے بھئی تم کب آئے۔ اور ایسے بغیر اطلاع کے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم جلدی لوٹ آئے ورنہ کیسے ملاقات ہوتی۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر پپّا نے پوچھا، ارے ریاض بیٹا، چچا کو چائے وائے کو بھی پوچھا یا نہیں۔" اس کے بعد ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ارے بچّو، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ بڑوں میں بچّوں کا کیا کام چلو بھاگو یہاں سے۔"

مگر چچا بے حد اداس لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "سرفراز، مجھے ریاض کے

بارے میں جان کر بے حد غم ہوا کہ بیچارہ ایسا ہونہار جوان اور کتنی منحوس بیماری...

"ریاض ـــــ اور بیمار؟" پپّا حیرت سے بولے۔ "یار دماغی مریضوں کا علاج کرتے کرتے تم بھی کچھ سٹھیا گئے ہو۔"

ڈاکٹر چچا کچھ غصّہ سے بولے۔ "میں سٹھیا گیا ہوں یا تم یا پھر ان بچّوں نے جھوٹ کہا......"

"کیا کہا بچّوں نے؟" پپّا کچھ حیرت اور کچھ ناگواری سے بولے۔

ایک دم بھائی جان جو بے چارگی کی تصویر بنے بیٹھے تھے اپنی جگہ سے اٹھے۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے کہنا شروع کیا۔ "چچا جان سو روپے ہارنے کا غم تو ہے لیکن آپ کو زیادہ دیر غلط فہمی میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب بھی ہمارے ہاں مہمان آتے ہیں اور پپّا میر التعارف......"

لیکن ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دھیرے دھیرے ایک ایک کرکے اپیا، منّے بھائی اور میں ڈرائنگ روم سے کھسک چکے تھے۔ ہم تینوں اپنے کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور ادھر ڈرائنگ روم سے اونچے اونچے قہقہوں کی آوازیں ہمارا دل دہلائے دے رہی تھیں۔

اس دن کے بعد سے اتنا ضرور ہوا کہ اب جب کبھی ہمارے ہاں مہمان آتے ہیں، پپّا خاص طور سے ہم تینوں کو بلا کر تعارف کراتے ہیں۔

"یہ میری بڑی بیٹی ریحانہ ـــــ امورِ خانہ داری میں ماہر......"

"یہ میرے منجھلے بیٹے ـــــ ہندوستان کے ہونے والے نامور ادیب۔"

"اور یہ چھوٹی بٹیا ـــــ ملک کی ہونے والی مایۂ ناز آرٹسٹ!"

لیکن ساتھ ہی ساتھ غم ہے تو اتنا کہ ہمارے سو روپے واقعی بھائی جان نے ہتھیا لئے حالانکہ وہ سراسر شرط ہار چکے تھے ـــــ

فرمائشی پروگرام

بھائی جان سے خدا بچائے ـــــ طرح طرح کے شوق اپنے پیچھے لگا رکھے تھے۔ لیکن ادھر چند دنوں سے اپنے چند انگریز دوستوں کی صحبت میں انھیں جیسے "آثار قدیمہ" کا چسکا پڑ گیا تھا۔ جہاں کوئی بھی انتہائی سڑی لبھی اور انتہائی بیکار چیز دکھائی دی ـــــ انھوں نے جھٹ اسے پونچھ پانچھ کر اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔

"بھئی ہم ہندوستانی لوگ پرانی چیزوں کی قدر ہی نہیں جانتے ـــــ اب بھلا دادا جان کی یہ چھڑی پھینکنے لائق چیز تھی" وہ اُسے باقاعدہ عجوبے کا رتبہ دینے پر تل ہی جائیں تو ہم آپ کیا کر سکتے ہیں ـــــ؟ مگر قسم لے لیجئے ان کا کمرہ جو کبھی بھی ایک کباڑیئے کی دوکان سے زیادہ اہم نظر آیا ہو ـــــ!

ایک دن گھر کا پرانا سامان بیچا جا رہا تھا ـــــ اور ایسی ایسی عجائب گھر میں رکھنے لائق چیزیں برآمد ہو رہی تھیں۔ بھائی جان اپنا کیمسٹری کا پرچہ (جو اگلے دن ہونے والا تھا) چھوڑ چھاڑ پسینہ پسینہ ہوئے لپیں جتے ہوئے تھے۔

اِدھر وہ زور سے چلائے ـــــ سب سمجھے پرانے سامان سے بچھو یا سانپ نکل آیا، مگر بھائی جان کو تو وہ خزانہ میسر آیا تھا کہ وہ لندن کے میوزیم کی مارکٹ

ڈاؤن کرنے پر آمادہ نظر آرہے تھے۔" بنی ہے ـــــ اچھا ہی ہوا جو آج میرا پرچہ نہیں تھا اور میں گھر ہی پر تھا، ورنہ آپ لوگوں سے بعید نہ تھا کہ اس قدر اچھا گراموفون اٹھا کر اونے پونے بیچ ہی ڈالتے۔

سب کی توجہ ادھر پھیری تو پتہ چلا کہ رنگ و روغن سے محروم، انتہائی یتیم قسم کا ایک گراموفون بھائی جان کی گود میں پہلوٹھی کی اولاد کی طرح چپکا ہوا تھا ـــ پرانا سامان خریدنے والا کباڑیا اس شدید قسم کی چاہت سے گھبرا سا گیا اور یہ سمجھ بیٹھا کہ واقعی خود اس نے بھی غلطی سے ایک خزانہ کھو دیا ہے ـــ اس لئے وہ گھبرا گھبرا کر بھاؤ بڑھانے لگا۔ حد یہ کہ ۵ روپے میں ابھی ابھی جس گراموفون کو مانگ چکا تھا بڑھاتے بڑھاتے اسے ۲۵ تک لے گیا۔ مگر بھائی جان غیض و غضب کی مورت بنے غرا رہے تھے ـــ "آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہے جناب ـــ" آپ ۲۵ کی بات کر رہے ہیں اور میں کہتا ہوں کوئی نہ کوئی صاحب ذوق اسے ۲۵۰۰ میں خرید لے گا" فونو کی گرد صاف کرتے ہوئے وہ انتہائی باپوں والے انداز سے اسے گود میں بھرتے رہے۔" یقیناً یہ دنیائے گراموفون کا سب سے پہلا ماڈل ہے ـــ انہوں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے انتہائی فخر سے اعلان کیا۔" اور آپ سب یہ مطلق نہیں جانتے کہ ایسی چیز ـــ یعنی پہلا ماڈل قسم کی چیز اگر کسی نمائش میں ہی رکھ دی جائے تو کس قدر انعامات ملتے ہیں۔"

چلئے صاحب بڑی مشکلوں سے بھائی جان کا امتحان ختم ہوا ـــ جس دن

امتحان ختم ہوا اُسی دن سے وہ گراموفون کی سیوا میں جت گئے۔ اب آپ جانیں ایسے موقع پر دلچسپی نظر آئے نہ آئے بچے تو یوں ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں — اب بھائی جان قطعی ہیرو بنے پسینے میں شرابور فونو کی نبض تلاش کر رہے ہیں۔ اور گھر کے بچے دوڑ دوڑ کر آلم غلم لا رہے ہیں —

"بھائی جان — یہ دیکھئے یہ کیروسین آپ نے مانگا تھا — صاف کرنے کے لئے۔ یہ میں لے آیا —"

"بھائی جان یہ موبل آئل ہے — کبھی کام پڑ جائے اسلئے میں خود ہی لے آئی۔"

"بھائی جان یہ ریکارڈ ہیں — آپ بجا کر تو دیکھیں گے ہی۔"

"بھائی جان یہ سوئیاں ہیں — اب ریکارڈ بجانا شروع کیجئے نا —"

بھائی جان نے گراموفون کی آنتیں گردے کلیجی، سب کچھ نکال کر زمین پر بکھرا دیا تھا اور بڑی شد و مد سے ڈاکٹری پر تلے ہوئے تھے۔ سب بچوں کی آنکھیں بغیر ٹلک مارے ایک ہی نقطہ پر جمی ہوئی تھیں کہ دیکھئے کب اس آپریشن کے کامیاب ہونے کی خبر ملتی ہے — مگر بھائی جان نے سب کے ارمانوں پر یہ کہہ کر اوس ڈال دی کہ پوری مشنری کو کم از کم ایک رات تک کیروسین آئل میں بھگو کر رکھنا پڑیگا تاکہ اس کا زنگ چھوٹ جائے — بارہ گھنٹوں کی مدت کچھ کم طویل نہیں ہوتی جب کہ ابھی خود دن کے ۵ ہی بجے تھے — یعنی کم و بیش ۲۴ گھنٹوں کا صبر آزما اور جان لیوا انتظار تھا — مگر مجبوری بھی تو ایسی ہی تھی! ایک بڑے سے برتن میں

بہت ساجلانے کا تیل ڈال کر پوری مشینری کو اس میں ڈبو دیا گیا ۔۔۔ (بہ اتفاق رائے بچوں کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسی دن گراموفون ڈوب کر نیست و نابود ہو گیا ہوتا تو کسقدر اچھا ہوتا ۔ مگر ابھی تو بہت سے مرحلے طے ہونے باقی تھے ۔۔۔)

بہرحال رات گذری اور دوسرے دن مشینری کو ٹوٹے پھوٹے کھوکھے میں فٹ کر دیا گیا جس کے متعلق امی ایک سال سے کہے جا رہی تھیں کہ مرغی بند کرنے کے لئے بہت اچھا ڈربہ بن سکتا ہے ۔ مگر بھائی جان کسی صورت مان کر نہیں دے رہے تھے

اچانک بھائی جان کو خیال آیا کہ کیوں نہ کسی قریبی گراموفون کی دوکان پر لے جا کر اس کی تھوڑی بہت مرمت کروالی جائے ۔۔۔ دو چار قریبی دوست نما بچوں کی سنگت میں بھائی جان دوکان ہو آئے ۔ بچے ٹلمبک نائی بننے پر تلے ہوئے تھے اور بار بار چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ " دوکاندار نے پہلے تو اس عجیب و غریب شے کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ۔ اور جب بھائی جان کے انتہائی یقین دلانے پر کچھ کچھ یقین کیا کہ شاید فونو ہی ہو سکتا ہے تو اس قدر ڈر ڈر کر کھولا کہ مداری کی پٹاری کی طرح اس میں سے سانپ نہ برآمد ہو جائے ۔۔۔ بہرحال اس نے کہا ہے کہ ڈربے کو پینٹ وغیرہ کر کے چمکا دے گا ۔ ساونڈ بکس کی خرابی بھی دور کر دے گا مگر جملہ کام کے ۵۰ روپے لے گا ۔"

بھائی جان مر مر کر چیخ رہے تھے " اس نے اتنا عجوبہ روزگار گراموفون ۵۰ روپے میں خود خریدنا چاہا ہے ، بچوں نے غلط سن لیا ہے ۔" مگر کسی نے ان کی بات پر کان نہ دیئے ۔۔۔

تیسرے دن امّی کے منی بیگ میں سے ۴۵ روپے چوری ہو جانے پر پرانے نوکر رحیم کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور شام کو گراموفون گھر میں آ گیا اور بالکل عید کا سا سماں پیدا ہو گیا ـــــ واقعی گراموفون کی صورت ہی بدل گئی تھی (مگر صرف صورت!!) بے حد چم چم چمک رہا تھا بھائی جان نے اس کا ایک فائدہ یہ گنوایا کہ اب شیو کرتے ہوئے آئینے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ مگر جب اندر سے کھول کر دیکھا گیا تو نادرہ نے (جو بہت ہی طرار مشہور تھی) فوراً فقرہ چست کیا۔

"لے ہے اتنے خوبصورت گھونگھٹ میں سے کیا بدصورت دلہن برآمد ہوئی ہے ـــــ" کوئی اور موقع ہوتا تو بھائی جان اس کی چوٹی کھسوٹ ڈالتے مگر اس وقت تو وہ پورے تن من دھن سے "گراموفون سیوا" میں مگن تھے۔

اب بھائی جان نے برسوں کا پٹا پٹایا شعر سنانا شروع کیا ؎

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا

اور پھر حاشیہ آرائی کو مزید کہنے لگے "اور یہاں تو پھر یہ معاملہ ہے کہ صورت بھی اچھی ہے اور سیرت بھی۔ اور انھوں نے بسم اللہ کہہ کر ساؤنڈ بکس میں سوئی لگا دی۔ گھر گھر کر کے چابی بھری اور کھٹکا دبا دیا ـــــ چکر چلنا شروع ہو گیا مگر کچھ ایسا لگتا تھا کہ کمرے میں طوفان آ گیا ہے۔ منّی سہم کر اپنی آپا سے چمٹ گئی۔ ذرا بڑے والے بچے گھبرا کر اپنے سے ذرا بڑے بچوں سے چمٹ گئے اور سب سے

بڑے بچے دیدے گھما گھما کر سوچنے لگے کہ ہندوستان میں بمباری کے تو قطعی امکانات نہیں تھے۔ پھر؟
تب تک بھائی جان نے کھٹکا بند کر دیا تھا۔ اور کمرے میں سمندری طوفان کے بعد کا
سا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ ۔ ۔ بھائی جان نے زور دار گالی جھاڑی۔

"سالے گدھے کے بچے نے دس روپے یوں ہی کھا لئے ـــــ ابھی جا کر اس کے
کان کھینچتا ہوں۔" اور وہ گراموفون کو لادے پھرتی سے باہر نکل گئے ـــــ چنو جو باڈی
گارڈ کے طور پر اپنے بھائی جان کے ساتھ ہی ساتھ رہتے تھے۔ اس بار بھی دوکان
ہو آئے اور آ کر سب کو سنا دیا کہ وہ دوکان والا مزید دس روپے مانگتا ہے تب
آواز آنی بند ہو جائے گی۔ (آثار کچھ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ گھر کے سب نوکروں کی
مفت رفتہ چوری کے الزام میں چھٹی ہو جائے گی)

دوسرے دن پھر گراموفون آ گیا ـــــ اب کے ساؤنڈ بکس میں کچھ خرابی
تھی کہ جیسے ہی آہستہ ریکارڈ پر ٹکایا جاتا وہ ایک سکنڈ میں کھسل کر ایک دم ریکارڈ
کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیتا ـــــ پھر سے گراموفون دوکان بھجوایا گیا ـــــ
اب کی بار دوکاندار نے ۲۰ روپے مزدوری مانگی ـــــ (خبر: بزبان چنو میاں!)
چوتھے دن گراموفون آیا ـــــ ڈرائنگ روم میں سب فرش پر گھیرا ڈال کر
بیٹھ گئے۔ بیچ میں گراموفون رکھ دیا گیا۔ اب خدا کے فضل سے اس میں کسی قسم
کی کوئی خرابی باقی نہ تھی ـــــ اس لئے بھائی جان نے گھر کے پورے بچے
بچے کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے جمع کر رکھا تھا ـــــ بسم اللہ پڑھ
کر (جو شاید بھائی جان نے بسم اللہ پڑھ لینے کے بعد سے دوسری بار ہی پڑھی ہو گی بس!)

بھائی جان نے چابی بھری۔ سوئی لگائی، ریکارڈ چڑھایا اور بس ریکارڈ چلنا ۔۔۔ جی ہاں چلنا شروع ہوگیا ۔۔۔ بجنا نہیں ۔۔۔ کیونکہ جہاں تک ہماری اپنی معلومات کا تعلق ہے ہم تو بچپن سے یہی سنتے آئے ہیں کہ ریکارڈ بجا کرتا ہے، مگر اب ہماری آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ریکارڈ بس مسلسل گھومے جا رہا تھا۔ بھائی جان دہرے ہو کر بالکل ساؤنڈ بکس پر جھکے ہوئے تھے۔ بہت دیر بعد (جب آدھا ریکارڈ چل چکا تھا) وہ ایک دم سے چلّا کر بولے ۔۔۔

"نج رہا ہے ۔۔۔ نج رہا ہے۔"

نادرہ نے فقرہ چست کیا۔ "نج رہا ہے اور بے آواز ہے۔" دراصل اس وقت نسیم بانو کا گایا ہوا ریکارڈ گراموفون پر چڑھا ہوا تھا جس کے بول ہیں "زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے۔ نج رہا ہے اور بے آواز ہے" کمرے میں قہقہوں کا طوفان گونج اٹھا۔ بھائی جان نے جھلا کر نادرہ کو دیکھا ۔۔۔ مگر صرف دیکھنے ہی کی حد تک، کیونکہ اُن کے صرف اس طرح گھور کر دیکھ لینے ہی سے محفل پر سناٹا چھا گیا تھا۔ اتنے میں سب چونک اُٹھے کیونکہ واقعی کمرے میں آواز گونجنے لگی۔

"کوئی نغمہ ہے نہ کوئی ساز ہے ۔۔۔" مگر پتہ چلا کہ پھر نادرہ نے گلے بازی شروع کر دی تھی ۔۔۔ اب بھائی جان خاموشی سے اُٹھے اور نادرہ کو چوٹی سے کھینچ کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ اور آ کر اعلان کیا۔ "وہ ریکارڈ تو ختم ہو گیا۔ اب دوسرا بجائیں گے۔ سب اپنی اپنی پسند کے ریکارڈ کا نام

کہہ دو تاکہ میں ایک دم چھانٹ لوں۔

چھ سات بچّوں نے اپنی اپنی پسند کے گانے بتا دیئے۔ ساتوں ہی ریکارڈ بج گئے، مگر کمرے میں وہ سناٹا تھا کہ سوئی گرتی تو چھن سے آواز آجاتی ـــ آخر لوگوں سے صبر نہ ہوا تو لمبی لمبی سانسوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بھائی جان بُری طرح چیخے۔ "یہ کون سانس لے رہا ہے۔ سانس کی آواز میں گانے کی آواز دب رہی ہے نا ـــ خبردار جو....."

بھائی جان کی آواز منہ کی منہ میں ہی تھی کہ آواز آئی۔ "ہمیں تو شروع ہی سے صرف سانسوں کی آواز آرہی ہے۔ بھائی جان"۔ یہ معصوم جواب ننھی کی طرف سے تھا۔ بے ساختہ قہقہے لگے اور بھائی جان پھر تپ گئے۔ پھر انھیں احساس ہوا کہ ممکن ہے ان بچّوں کو آواز آ ہی نہ رہی ہو ـــ اس لئے انھوں نے سب کو بے حد قریب آنے کا حکم دیا اور سب بچّے تقریباً دہرے ہونے کی حد تک جُھک جُھک کر ریکارڈ سننے لگے۔

انتہائی منمنی آواز میں کچھ سنائی دے رہا تھا ـــ مگر واضح نہ ہو پا رہا تھا کہ ہے کیا بلا ـــ؟ بھائی جان کا اصرار تھا اُسے گیت سمجھا جائے، مگر کھڑکی پر بیٹھی ہوئی نادرہ نے اعلان کیا کہ رات ہی کتیا نے بچّے دیئے ہیں اور وہ پلّے منمنی آوازوں سے رو رہے ہیں۔ بھائی جان نے دو چار سوئیاں اٹھا کر نادرہ کے منہ پر پھینکیں۔ مگر سوئیوں کے وہاں تک پہونچنے سے قبل ہی وہ کھڑکی سے کود کر فرار ہو چکی تھی۔

بڑی مشکلوں کے بعد بچّوں نے اقرار کیا کہ ہاں اتنی دیر کے بعد کہ اُن کی کمریں دکھنے لگی تھیں، ایک باریک آواز کانوں میں آتو رہی ہے۔"

"کیوں درد بھرے دل کی آواز سنائیں گے۔"

مگر پتہ چلا کہ بہ اتفاق رائے جس آواز کو ریکارڈ کی آواز سمجھ لیا گیا تھا وہ کسی فقیر کی آواز تھی جو بھائی جان کے حسبِ حال گاتا ہوا گلی میں سے گذر رہا تھا ــــ سرگوشیوں کی آواز ڈوبنی ابھرنی شروع ہوئی اور بھائی جان کے پسینہ نکلنا شروع ہو گیا۔

آپ جانیں اتنا بڑا گھر اور اس میں اتنے سارے شیطان بچّے جب بالکل ہی سناٹا چھا جائے تو امّی کو پریشانی کیسے نہ ہو کہ آخر سب گئے تو کہاں گئے ــــ ؟ اِدھر اُدھر ڈھونڈتی ڈھونڈتی جب وہ ڈرائنگ روم میں آئیں تو حیرت زدہ سی ہو کر بولیں۔" ارے یہ جمگھٹا کاہے کا ہے۔ اور یہ خاموشی کیسی ہے ؟"

بھائی جان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر "شی" کیا ــــ یعنی خاموش رہیے۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔" ریکارڈ بج رہے ہیں۔"

" امّی بے حد پریشان ہو کر آگے بڑھ آئیں۔" اوئی یہ کیسا ریکارڈ ہے کہ دم سادھے سُن رہے ہیں ؟"

بھائی جان کا اشارہ پا کر امّی بھی اسی پوزیشن میں آگئیں (کمر میں درد ہو جانے والی پوزیشن میں) بہت غور و توجہ سے سننے کے باوجود بھی امّی کے

کچھ چلے نہ پڑا تو بھائی جان نے بڑی ڈھٹائی سے اعلان کیا کہ "چونکہ امّی کی عمر زیادہ ہو چکی ہے اس لئے عمر کا تقاضا یہی ہے کہ کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دے ـــــ امّی اس سلسلہ میں مجبور ہیں۔"

بہر حال امّی بھی حاضرین جلسہ میں شامل ہو کر فرمائشی ریکارڈ سننے لگیں جس کا طریقہ کچھ یوں تھا کہ ایک ریکارڈ چڑھایا جاتا۔ تین منٹ تک چلتا۔ پھر سوئی آخری نقطہ پر پہنچ جاتی تو دوسرا ریکارڈ بدل دیا جاتا۔ بھائی جان آخر کار بڑے بھائی تھے کسی کی ہمت نہ ہو سکی کہ محفل میں سے یونہی اٹھ کر فرمائشی پروگرام سننے اٹھ کر چلا جاتا۔ رات گئے تک ریکارڈ بجتے رہے، چلتے گھومتے رہے۔

اچانک پتہ نہیں کیا ہوا کہ انتہائی خاموشی میں کوئی بُری طرح چیخا۔

"تو بھاگ مسافر بھاگ یہاں سے بھاگ۔"

اتنا سنتے ہی سب جو بھاگے ہیں تو پلٹ کر دیکھنے کا نام تک نہ لیا بس امّی اور بھائی جان پیچھے رہ گئے۔ پتہ نہیں اچھے خاصے گراموفون میں کیا خرابی آگئی تھی کہ خاموشی سے چلتے چلتے چیخ اٹھا۔ اور گیت کی آواز کو واقعی بھاگ جانے کا فرمان سمجھ کر سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے ـــــ بس اتنی ہی ایک لائن زور سے بجی ـــــ

پھر اپنی پرانی اسٹائل سے گراموفون بجے نہیں چلنے لگا۔

"اگر صرف ۱۰۰ روپے اور لگا دیئے جائیں تو گراموفون بالکل ہی نیا ہو جائے۔"

کمرے میں جھانک کر نادرہ نے ہنسنے کا تیر چلایا اور فوراً غائب ہو گئی۔

اُسی رات کا ذکر ہے کہ سب سو رہے تھے، میں اکیلی جاگ رہی تھی کہ بھائی جان کے کمرے میں کچھ کھڑبڑ ہوئی۔ میں نے چونکنا ہو کر دیکھا بھائی جان ٹیرس پر دونوں ہاتھوں میں گراموفون تھامے آئے اور پوری طاقت سے اسے نیچے پھینک دیا۔

دوسرے دن جب بچّوں نے فرمائشی ریکارڈ بجانے — یعنی چلانے کی فرمائش کی تو بھائی جان نے اعلان کیا کہ وہ گراموفون چوں کہ بہت ہی نادر تھا اس لئے ان کے ایک انگریز دوست کے والد نے بارہ سو میں خرید لیا ہے۔" اور اس حادثے پر بھائی جان بے حد ہی غمگین تھے کہ دوستی کا معاملہ تھا، چپ رہ جانا پڑا، ورنہ ایسی ایسی چیزیں، کہیں دینے کے لائق ہوتی ہیں، وہ تو عجوبۂ روزگار کے طور پر خود ہی سنبھال کر رکھی جاتی ہیں۔"

*

بھائی جان اور دھوبی

بھائی جان اور دھوبی کی سدا سے کھٹ پٹ چلی آرہی تھی ۔ بھائی جان ٹھہرے ایک فیشن ایبل آدمی ۔ اور دھوبی ٹھہرا ایک ہی نکا چڑھا آدمی ۔ بھائی جان ہمیشہ صاف ستھرے کلف کے استری والے کپڑے پہننا چاہتے مگر دھوبی اسی مناسبت سے بجید مڑے تڑے کپڑے بھائی جان کے حوالے کر جاتا ۔ ممکن تھا وہ نرمی اور مروّت میں کبھی اچھی استری کر بھی دیتا لیکن بھائی جان ایسے کڑوے مزاج کے آدمی تھے کہ جان جان کر استری میں نقص نکالتے ۔ وہ بھی بدلے لینے کی خاطر اوروں کے کپڑے تو جھٹ پٹ استری کر کے دے دیتا اور غریب بھائی جان کے کپڑے برسوں انچولہ بنے اس کی الگنی پر جھولتے رہتے ۔

اس روز روز کی کھٹ کھٹ سے تنگ آکر بھائی جان نے خود ہی ایک عدد استری خرید نے کا تہیہ کر لیا اور صرف سوچ کر ہی بس نہ کیا بلکہ بجلی سے چلنے والی جگ مگ کرتی استری ان کے کمرے کی زینت بن بھی گئی ۔ بچوں کو تو آپ جانیں ایسے موقعے خدا دے کہ گھر میں کوئی نئی چیز آئے ۔ سب کے سب بھائی جان کے کمرے میں جمع ہو گئے ۔ اب بھائی جان ہیں کہ مارے اتراہٹ کے

اکڑے جا رہے ہیں۔ منّی بے چاری نے ذرا ہاتھ لگایا کہ اُبل پڑے۔

"ارے — کیا کرتی ہے یہ خراب ہو جائے گا۔"

"ابے او جنّو اس کے تار کو کیوں ہاتھ لگا رہا ہے!"

"سنو یاد رکھ اگر میلی ہوگی تو تیرے چہرے پر چھٹی ٹھوک دوں گا۔"

مارے ارمان کے میں اپنی فراک اٹھا لائی۔ "ہے ہے میرے بھائی جان کیسے اچھے! ذرا میری فراک سے ہی شروعات ہو جائے۔"

مگر انھوں نے تو میری فراک کو دیکھ کر یوں ناک سکوڑی جیسے میں فراک نہیں بلکہ مرے ہوئے چوہوں کا پنجرہ اٹھا لائی تھی، اف وہ لہجے کی حقارت!

"ہونہہ — مجھے اپنی استری کا ماتم نہیں کرنا ہے کچھ — ایسے لڑے پڑے بدرنگ فراک کے کپڑوں کو استری کرتا پھروں گا تو استری آج ہی چوپٹ، کیوں کیا تمہارا دھوبی مر گیا ہے۔"

مارے غصے اور شرمندگی کے میرا منہ تپ گیا۔ یہ لو — کیسے سڑے ہوئے یہ بھائی جان ہیں۔ خود کے کپڑے کون مردہ چوہوں سے کم ہوتے ہوں گے کہ ہم پر رعب جما رہے ہیں۔ مارے نفرت کے مجھے ان کی طرف دیکھنا دوبھر ہو گیا۔ میں پیر پٹختی آ گئی اور باغیچے میں جا کر بیٹھ رہی۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اسی دن ہمارے دھوبی رام دین کی استری کھو گئی تھی! ابھی میں جا کر بیٹھی ہی تھی کہ سر پیٹتا، چھاتی کوٹتا رام دین چلا آیا۔

"ہائے بی بی — میری استری۔"

میں جھنجھلا کر بولی۔ "کیا ہوا تمھاری استری کو؟"

"ارے ہوتا کیا بی بی جی ــــ کھو گئی میری استری۔ آپ جانیں غریب دھوبی کی زندگی اور روزی کا آدھا سہارا اس کی استری ہی ہوتی ہے۔ ہائے ہائے ــــ اب میں کیا کروں بی بی۔ تم نے دیکھی کہیں میری استری؟"

"اچھا" میرا ذہن قلابازی کھا گیا۔ "تو یہ بھائی جان ان گنوں کے ہیں۔ غریب دھوبی کی استری مار لائے اور ہم پر ٹھاٹھ کر رہے ہیں کہ استری خرید کر لائے ہیں! ہونہہ ــــ میری ساری ہمدردی سراسر رام دین کی طرف منتقل ہو گئی۔

"تمھاری استری کیسی ہے بھلا ــــ؟" میں نے ٹوہ لینے کو پوچھا۔ وہ ہاتھ ملنے لگا۔ "اب کیا بتاؤں بی بی جی ــــ کئی بار تو آپ نے بھی میرے کمرے میں دیکھی ہوگی۔"

"نئی ہے نا ــــ؟" میں نے ثبوت لینا چاہا۔

"ہاں بی بی نئی ہی تو ہے ــــ وہ پرانی تو دغا دے گئی ــــ ابھی ابھی تو اسے گاؤں سے جا کر لایا تھا۔"

ایں ــــ! میں نے خود سے پوچھا ــــ گاؤں سے استری ــــ؟

تو کیا گاؤں میں بھی استری ملتی ہے ــــ ہونہہ ملتی ہوگی ــــ مجھے کیا ــــ

میں نے سرتاپا رام دین کی ہمدرد بن کر کہا۔

"دیکھو دھوبی میں بتاتی تو ہوں پر کسی کو میرا نام نہ بتانا۔"

دھوبی راز سننے کی خاطر اکڑوں بیٹھ گیا اور بڑے تجسس سے مجھے دیکھنے لگا۔ "قسم سے بی بی جی جو کبھی آپ کا نام بتاؤں تو"

میں نے مورچہ مضبوط پاکر داؤ اگلا۔" تمھاری استری بھائی جان کے پاس گئی۔"
دھوبی زمین سے ۲ گز اوپر اُچھلا اور پھر مینڈک کی طرح زمین سے آلگا۔
"میری استری بڑے بھیا کے پاس —— تم جھوٹ تو نہیں کہہ رہیں بی بی؟"
"لے لو —— مجھے کیا پڑی تھی کہ جھوٹ کہتی پھرتی؟" میں نے منہ پھُلا لیا
اگر جھوٹ کہنا ہوتا تو فائدہ ہی کیا تھا —— رام دین نے مزید ٹوہ لینے کو پوچھا۔
"اچھا بی بی —— یہ بتاؤ وہ ساڑی کون سے رنگ کی لپیٹے تھی؟"
مجھے فوراً یاد آگیا بچے ہاتھ لگا لگا کر میلی نہ کردیں اس مارے بھائی جان
نے آپا کی ہری ساڑی میں اسے لپیٹ دیا تھا —— میں یاد کرکے وثوق سے بولی
"ساڑی تو ہرے رنگ کی تھی ——"

"ہائے رام ——" دھوبی نے چھاتی پیٹ لی۔" اندھیر ہے بھگوان اندھیر"
ہائے غریب کی آنکھیں آنسوؤں سے ابل رہی تھیں —— دھوبی کی تڑپ دیکھی
نہ جاتی تھی —— مجھے خود بھائی جان پر سخت غصہ آرہا تھا —— خود کو کیا
روپیوں کی کمی پڑی تھی کہ چوری پر تل گئے —— اب بیچارہ کتنی بار نئی استریاں
خریدتا جائے۔ میں نے بڑی ہمدردی سے پوچھا۔
"تم کتنے روپئے میں لائے تھے دھوبی —— ؟"
وہ روتے روتے بولا۔" غریب کا دم ہی کتنا بی بی جی —— بس دو بیسی
کی تھی۔ مگر دو بیسی بھی کچھ کم ہوتے ہیں کیا؟" اور وہ پچھاڑیں کھانے لگا۔
"پولیس میں رپورٹ کردو" میں اس کے رونے پر پگھل کر بولی۔ پچھلے دنوں

ہماری کوٹھی میں چوری ہو گئی تھی تو سچ مچ پولیس آئی تھی اور چور پکڑا گیا تھا۔

دھوبی سہم کر بولا۔ "بڑے بھیا کو پکڑا دوں ــــ"؟

"پھر کیا ــــ" میں لاتعلقی سے بولی۔ "جیسا جو کرے گا ویسا بھرے گا، غریب کی چیز لینا آسان تھوڑی ہے۔ میاں جی کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔"

دھوبی میری ہمدردی سے بے حد مرعوب ہوا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"پولیس کی بات تو بڑی ہے بی بی ــــ سرکار سے کہتا ہوں میں۔"

"ابا سے ــــ؟" میں مایوس ہو کر بولی۔ "ابا بھلا کیا کریں گے۔"

میرا جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ بھائی جان کی اکڑ نکلے اور لوہے کی ٹھن ٹھناتی چوڑیاں انھیں پہننے کو ملیں۔

"نہیں بی بی ــــ گھر کی بات گھر ہی میں رہے تو اچھا نا؟ سرکار سمجھا بجھا دیں گے تو آگے سے وہ غریبوں کے ساتھ ایسی بے دردی نہ کریں گے۔"

"خیر ــــ تمہارا یہی کہنا ہے تو یہی سہی ــــ مگر دیکھو ذرا اچھے سے کہنا ورنہ"

"تمھیں تو معلوم ہے کہ بھائی جان ابا میاں کے بڑے لاڈلے ہیں۔" دھوبی بولا "بی بی جی میں دو چار پاس پڑوسیوں کو ساتھ لے آتا ہوں گواہی کے لئے آپ بھی موجود رہنا۔"

"ہاں ہاں میں ڈرتی تھوڑی ہوں۔" میں بہادری سے بولی۔ اور دھوبی اپنی دھوتی سنبھالتا جھونپڑیوں کی طرف بھاگ گیا۔

دس پندرہ منٹ میں دھوبی اپنے کئی ساتھیوں کو لے کر نمودار ہوا ــــ

پوری پلٹن ابا میاں کے دفتر میں پہنچی جو بیک وقت ان کی آرام گاہ بھی تھا عدالت بھی اور آفس تو خیر تھا ہی۔ وہ اپنے کسی مقدمے کی کارروائی میں الجھے ہوئے تھے ـــــ پیروں کی دھپا دھپ سُن کر سر اٹھایا اور حیرت سے بولے۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟"

سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ـــــ ابا میاں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیا قصہ ہے بھئی"

"جی ـــــ جی ـــــ" رام دین میری طرف دیکھتا ہوا سسک کر بولا "حضور بڑا اندھیر ہے بڑا اندھیر" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"بی بی جی سے آپ ہی پوچھ لیں"

"کیا ہوا بیٹی" ابا نے نرمی سے پوچھا۔

"تم ہی کہو نا ـــــ" میں بہادری سے بولی۔ "ڈرنے کی کون سی بات ہے ایسی؟"

دھوبی رک رک کر بولا "حضور کیا بولوں ـــــ بڑے بھیا میری استری لے گئے ہیں، غریب کی بھی تو عزت ہوتی ہے۔"

ابا تلملا گئے۔ "جاوید میاں کی ایسی حرکت ـــــ اور تم یوں دبے دبے انداز سے کہہ رہے ہو!!"

"اب کیا کہیں حضور ـــــ غریب آدمی ہیں ورنہ آپ لوگ تو ہمارے ماں باپ کی طرح ہیں، استری تو روزی روٹی کا آسرا ہوتی ہے۔ زندگی کا سہارا ہوتی ہے ـــــ" کہتے کہتے ہاتھ ملنے لگا۔

"ابا کی وکالت کی نس پھڑکی۔" کوئی ثبوت ـــ گواہ! یا یونہی کہے دے رہے ہو کہ تمہاری استری جاوید کے کمرے میں ہے۔" ابا میاں کو بھی دھوبی اور بھائی جان کی گھٹ پٹ کا تھوڑا بہت علم تو رہتا ہی تھا!! دھوبی نے بڑے اعتماد سے مجھے آگے کر دیا۔

"ہاں ابا میاں ـــ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے دھوبی کی استری بھائی جان کے کمرے میں ہے۔" ثبوت کے طور پر میں نے مزید جتا دیا اور ہری ساڑی پہنے ہے ـــ جی ہاں۔"

ابا جان کے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ سراسیمہ ہو کر بولے "بلا کر لاؤ تو اس ملعون کو۔" میں فخر کے ساتھ اندر بھاگی ـــ دوسرے لمحے بھائی جان کمرۂ عدالت میں حاضر تھے ـــ

ابا میاں نے ہر ممکن سنبھل کر انہیں مخاطب کیا۔ "بیٹے ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی۔"

بھائی جان کچھ نہ سمجھے حیرت سے بولے "کیسی امید نہ تھی ابا میاں ـــ"

ابا میاں کڑک کر بولے۔ "دھوبی کی استری کو اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہے اور معصوم بن کر پوچھتے ہو کیسی امید ـــ؟"

شہ پا کر دھوبی بولا "سرکار ـــ کبھی کبھار مجھ سے بھول ہو گئی کہ میں نے کپڑوں کو صاف نہ دھویا کلف نہ دیا برابر استری نہ کی۔ مگر یہ نہ سوچا تھا کہ میاں اتنا بڑا بدلہ لیں گے کہ میری استری....."

بھائی جان الجھ کر بولے "کیا استری استری بک رہے ہو ـــ میں آج ہی

خرید کر لایا ہوں ابا جان ۔"

"تو مفت کس کو ملتی ہے بھتیا ۔۔۔ ہم بھی تو پیسے دے کر ہی لائے تھے ۔"

"تو مطلب یہ کہ تمہاری استری میں نے چرالی ہے ۔۔۔ نا ؟" بھائی جان دیدے نکال کر بولے ۔

ابا میاں غصہ ہو کر بھائی جان سے مخاطب ہوئے " جاوید میاں غریب آدمی کو اپنے غصے سے نہ ڈراؤ ، سیدھی طرح بات کرو ۔ بٹیا نے خود تمہارے کمرے میں اس کی استری رکھی ہے ۔"

بھائی جان میری طرف پلٹے ۔" ہاں ری وہ دھوبی کی استری ہے ؟"

" ہو گی ۔۔۔ یقیناً ہو گی ۔" میں یقین کے ساتھ بولی ۔

" اچھا ۔۔۔" بھائی جان دھوبی سے مخاطب ہوئے ۔" میں خود لئے آتا ہوں تم غور سے ٹھونک بجا کر دیکھ لو کہ تمہاری ہے یا میری ۔"

اک دم باہر سے شور و غل اٹھا ۔۔۔ آگئی ۔۔۔ آگئی ۔۔۔ رام دین کی استری آگئی ۔ سب کے سب باہر لپکے ۔۔۔ ہری ساڑی میں لپٹی لپٹائی ، لاجونتی بنی ایک کم عمر سی لڑکی کو کئی لوگ گھیرے میں لئے آرہے تھے ۔ شور مچ رہا تھا ۔

" ارے گھر چھوڑ کر آخر جاتی کہاں ۔"

" ندیا کنارے تو گئی تھی ۔"

" اونہہ صبح کی گئی شام کو تو آگئی ۔۔۔ چلو بڑا بہنیں ۔"

" دھوبی کو سبق تو ملا ۔۔۔ اب سے نہیں مارے گا ۔"

اسی لمحہ بھائی جان اندر سے وارد ہوئے ۔۔۔ اس شان کے ساتھ کہ ہری

ساڑی میں لپٹی جگمگاتی استری ان کے ہاتھوں میں تھی ـــــ غصّے سے انہوں نے استری ابا جان اور دھوبی کے آگے پٹخ دی ۔" دیکھ لیجئے رام دین جی ـــــ یہ آپ کی ہے یا میری ۔ اور اس پر بھی یقین نہ ہو تو صدر مارکیٹ چلئے دوکان دار سے پچھوا دوں کہ آج ہی یہ استری میں نے خریدی تھی یا نہیں ؟"

میں حیرت سے کبھی اس استری کو دیکھتی تھی ـــــ کبھی اس استری کو ـــــ دھوبی کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ بھائی جان کے ننھے غصّے سے پھوں پھوں کر رہے تھے ، وہ میری طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچا ہی تو کھا جائیں گے ۔

ابا میاں نے بڑی رحم دلی سے دھوبی کو معاف کر دیا ۔" دیکھو ! آئندہ سے اگر اپنی استری کو مارا اور وہ گھر سے بھاگی تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا ـــــ اور آئندہ سے یہ بھی یاد رکھنا کہ اپنی استری کو دھوبن کہا کرو گے ـــــ سمجھے یا نہیں ـــــ ؟ "

بھائی جان نے دانت کچ کچا کر مجھے دیکھا مگر ابّا جان کی موجودگی میں اف بھی نہ کر سکے ، بے چارے بھائی جان ـــــ !!

ماں

اُن دنوں میں بہت چھوٹی تھی۔ لیکن سب سے چھوٹی نہیں تھی۔ مجھ سے
چھوٹے دو بھائی بہن اور بھی تھے۔ ہم سب ملا کر تین بچے تھے۔ میری امّی میرا
ذرا بھی دُلار نہیں کرتی تھیں۔ ہم لوگ بہت غریب تھے نا — دن بھر
کام کرنا پڑتا۔ امّی گھر کے کام کاج سے فرصت پاکر باہر والوں کی سلائی
کرنے بیٹھ جاتیں۔ خالی وقت جو میرے کھیلنے کُودنے کا ہونا چاہئے
تھا، وہ میرے حوالے چھوٹے بچے کر دیتیں۔

"زہرہ، چھوٹے بھیّا کا منہ دھلا دو۔"

"زہرہ، بہن کو کھانا کھلا دو۔"

"زہرہ، جھوٹے برتن پڑے ہیں۔ ذرا دھو ڈالو۔"

"زہرہ، چھوٹے بچوں کے کھلونوں سے نہ کھیلو۔ ٹوٹ جائیں گے تو کہاں
سے لاؤں گی؟"

"زہرہ، تھوڑے کپڑے پڑے ہیں دھو کر سُکھا ڈالو۔"

"زہرہ، چُولہا جلا کر دال چڑھا دو۔ بچے بھوکے روئیں گے تو سلائی
کیسے کروں گی؟"

زہرہ ——— زہرہ ———

بس کان پکڑ جاتے۔ بچّوں کے کام بھی کرو۔ گھر کے کام بھی کرو۔ مجھے تو امّی سے نفرت ہو گئی تھی ــــ ایسی بھی کوئی ماں ہو گی۔ نہ کبھی پیار سے بات کی، نہ سر پر ہاتھ پھیر کر پاس بٹھا کر کچھ کھلایا۔ دونوں چھوٹے بچّوں کا لاڈ دلار تو کر رہی ہیں اور مجھے پلٹ کر پوچھتیں تک نہیں کہ زندہ ہوں یا مر گئی۔ کھانا بھی پہلے دونوں چھوٹے بچّوں کو دیتیں بعد میں مجھے۔

اسکول جاتی تو کہیں جا کر گھر کی مصیبت سے نجات ملتی۔ جی چاہتا ہمیشہ اسکول میں ہی رہوں۔ لیکن بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ واپس آتی تو پھر وہی چکر شروع ہو جاتا ــــ وہی منظر۔

امّی چشمہ لگائے مشین پر جھکی بیٹھی ہیں، (ان کی آنکھیں سیتے سیتے کمزور ہو گئی تھیں نا۔) دونوں بچّے انھیں یا پھر ایک دوسرے کو ستا رہے ہیں، رو رہے ہیں، مشین پر اودھم مچا رہے ہیں، دھاگا نکال نکال کر پھینکے دے رہے ہیں۔ امّی خود کو کوس رہی ہیں۔ مگر مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر تازگی سی چھا جاتی۔

"زہرہ ــــ آ گئی تو۔"

"جی ہاں، آپ کی نوکرانی آ گئی۔" میں کہنا تو روز یہی چاہتی لیکن اسکول میں سکھایا گیا تھا کہ ماں باپ سے اور بزرگوں سے ہمیشہ ادب سے بات کرنی چاہیئے، اس لئے بس سیدھے سادے انداز سے کہہ دیتی "جی ہاں، امّی۔"

اسکول میں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کی باتیں سناتیں۔ اپنی اپنی امیوں کی محبت بھری باتیں، لاڈ دلار کی باتیں ــــ اور میں حیرت سے سوچتی ــــ کیا مائیں سچ مچ محبت کیا کرتی ہیں؟ ہونہہ، فضول باتیں ہیں۔ مائیں تو صرف کام لیا کرتی ہیں اور ڈانٹتی رہتی ہیں۔

ان ہی دنوں اسکول میں اُردو کے پیریڈ میں ٹیچر نے "ماں" کے عنوان پر مضمون لکھنے کو کہا۔ سب لڑکیوں نے مضمون لکھ دیئے میں نے احتجاجاً کچھ بھی نہ لکھا۔ کاپی یونہی میرے آگے کوری پڑی رہی ٹیچر نے حیرت سے پوچھا۔ "زہرہ تم نے کچھ نہیں لکھا؟"

میں نے دبے دبے غصے سے کہا۔ "ماں اچھی ہو تو کوئی کچھ لکھے بھی، وہ تو سدا ڈانٹتی اور اور کام ہی لیتی رہتی ہیں۔ محبت تو کبھی کی ہی نہیں ــــ میں ان پر کیا لکھوں۔؟"

ٹیچر ہنستی ہوئی چلی گئیں ــــ "ابھی بچی ہو نا ــــ ماں کی محبت کو کیا سمجھو گی بھلا"

"بچی ہوں ــــ میں نے جل کر سوچا۔" پورے گیارہ برس کی ہو رہی ہوں۔"

یہ اس رات کی بات ہے جب برسات ٹوٹ کر برسی تھی۔ سارا آسمان سیاہ ہو رہا تھا ــــ ہر طرف پانی، پانی اور

باقی ــــ

ہمارے چھپر نما گھر کی چھت سے مسلسل ٹپکا لگا ہوا تھا اور ہوائیں ــــ؟
ہوائیں تو اس قدر تیز چل رہی تھیں مانو جسم میں سوراخ کر دیں گی۔
اُس رات اتفاق سے مجھے بخار تھا۔ بخار کی شدت سے میرا جسم تپ رہا تھا۔ میں جاگ رہی تھی لیکن تکلیف کی شدت سے آنکھیں بھی نہیں کھل رہی تھیں۔

میرا بستر ٹھیک اس سوراخ کے سامنے تھا جو ٹین کی چادر میں پڑ گیا تھا۔ بارش اور ہوا کا زور بڑھا تو امّی لپکی ہوئی اندر آئیں۔ مجھے ہوا میں ٹھٹھرتا دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھیں۔

"ہائے اللہ، میری مینا! میری گڑیا! تو بخار میں بھُن رہی ہے۔ ہوا میں سُکڑ رہی ہے اور میں ساڑی لپیٹے پھر رہی ہوں!"

امّی کے پاس ایک ہی ساڑی تھی۔ میلی ہوتی تو دھو کر ڈال دیتیں۔ اور سوکھے تک یونہی تولیہ یا کوئی پھٹی پرانی چادر سر پر ڈالے گھومتیں کام کرتی رہتیں۔ بستر تو ہمارے ہاں برائے نام ہی تھے۔

پھر میں نے مُندی مُندی آنکھوں سے دیکھا کہ امّی نے ــــ میری پیاری امّی نے اپنی اکلوتی ساڑی جسم سے کھینچ کر اُتاری۔

چیر چیر کر کے اس کے کئی ٹکڑے کر ڈالے — ہر سوراخ میں ایک ایک ٹکڑا ٹھونستی گئیں کہ ہوا نادم ہو کر وہیں کہیں باہر ہی ٹھٹھک جائے اور اُن کی مینا سردی سے بچی رہے۔

اس بات کو کتنے برس ہو گئے ——؟ ہائے، کاش آج مجھے کوئی "ماں" جیسا پیارا عنوان دے دے اور ایک مضمون لکھنے کو کہے تو لکھوں ....

مگر کیا لکھوں ——؟ آنکھیں جب آنسوؤں سے بھری ہوں تو کچھ دکھائی دیتا ہے ——؟

ہمارے چچا

میں اور بھائی جان دو ماہ کی چھٹیوں میں گھر لوٹ رہے تھے۔۔۔ گھر آنے کی خوشی تو ہوا کرتی لیکن کوئی خاص دل چسپی نہ ہونے سے ہم بور ہوا کرتے۔ پھر بھی گھر آخر گھر ہوتا ہے۔ ہمارا رکشا ابھی پھاٹک میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ اکدم ایک نئی آواز سنائی دی۔ ایسا لگتا تھا گویا کوئی لڑ رہے ہوں۔ میں نے بھائی جان کو اور بھائی جان نے مجھے دیکھا۔۔۔ ہم رکشا سے اتر کر پورچ میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک صاحب کرسی پر نیم دراز تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی لپکے اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔۔۔ گھر کے سب بچے دوڑے آئے۔ تعارف ہوا۔۔۔ سلام کلام ہوا۔۔۔ اور ہمیں پتہ چلا کہ یہ صاحب ہمارے چچا ہیں۔ گاؤں میں رہتے ہیں اور آجکل ہم لوگوں سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ مجھے اور بھائی جان کو کھلونا ہاتھ آ گیا۔۔۔ عجیب ڈھب کے تھے ہمارے یہ چچا جان بھی۔

دو تین گذرنے پر یہ معلوم ہونے لگا کہ بغیر چچا کے زندگی بالکل بیکار ہے۔

چچا جیسا بیوقوف (اگر چچا پڑھ رہے ہوں تو معاف کردیں) آدمی ہم نے کہیں نہ دیکھا تھا لیکن خود کو اتنا عقلمند سمجھتے گویا کسی زمانے میں لقمان اور افلاطون کے استاد رہے ہوں۔ ایک دن بھائی جان نے مذاقاً پوچھا۔ "کیوں چچا یہ السٹریٹڈ ویکلی ہفتے میں کتنی بار نکلتا ہے ——"

چچا اپنے گنجے سر کو سہلا کر بہت ہی عالمانہ انداز میں بولے۔

"تم لوگ ام۔اے، بی اے ہو گئے تو کیا ہوا قابلیت نہیں آسکتی تم میں —— ارے بھائی ویکلی مہینے میں صرف ایک بار نکلتا ہے"۔

اور فاتحانہ انداز میں ابّا کو دیکھنے لگے گویا وہ داد دیں گے چچا کی عقل مندی کی۔

بھائی جان چچا کو بہت ستاتے اور بناتے رہتے ہیں۔ میں ذرا کم ہی ستاتی ہوں لیکن چچا کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ مجھی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں کہتے ہیں یہ لڑکی بڑی شیطان ہے —— میں نے ایک دن بالکل سنجیدگی سے پوچھا "کیوں جی چچا۔ بھلا یہ جگر مرادآبادی کہاں کے رہنے والے ہیں"

—— چچا پہلے تو بہت سوچتے رہے پھر بولے۔ "شاید لکھنؤ کا ہوگا" —— بھائی کی یہ حالت کہ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بنے جا رہے ہیں۔ میں بے مشکل ہنسی ضبط کرکے پوچھا۔ "شاید یہ لکھنؤ کا ہوگا تو پھر یہ مرادآبادی کیا بلا ہے" تو بڑے اعتماد سے بولے "اجی یہ تخلص ہے جیسے 'ابوسعید' قریشی' عبدالرحمٰن چغتائی"

چچا نے اب تک سنیما نہ دیکھا تھا۔ ایک دن ہم نے پروگرام بنایا کہ

چچا کو کچھ پر دکھائیں گے ۔۔۔ چچا اندھیرا ہوتے ہی بوکھلا گئے ۔۔ پھر پردے پر ہلکی ہلکی روشنی دیکھ کر ذرا سنبھلے ۔۔۔ اب کھیل شروع ہوا ۔۔ ہیرو نے کہا "اُفوہ دس بج گئے مجھے باہر جانا تھا" ۔۔۔ چچا نے جھٹ یہ کہہ کر اپنی گھڑی میں دس بجا لئے کہ "افوہ میری گھڑی تین گھنٹے پیچھے چل رہی ہے"۔

رفو کی سالگرہ تھی ۔۔ کئی مہمان آئے ہوئے تھے ۔۔۔ چچا تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتے ہیں اور جا بجا اپنی "عقل" خیرات کرتے رہتے ہیں۔ لان میں کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے ۔۔۔ ان میں چچا کی مانند کوئی عقل کے پورے بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔۔۔ بڑی پریشانی سے بولے ۔۔ "کیا کریں یار ہمارے ریڈیو میں دلّی کا اسٹیشن بالکل صاف نہیں آتا" ۔۔ چچا تھوڑی دیر تک تو سوچتے رہے پھر بولے "یہ تو بڑی آسان بات ہے" ۔۔

وہ صاحب اچھل کر بولے "کیا کوئی ترکیب لڑ گئی"۔

چچا بولے "جی ہاں آسان سی بات ہے۔ آپ دلّی چلے جائیے پھر آپ کا مطلب پورا ہو جائے گا یعنی کہ دہلی کا اسٹیشن صاف سنائی دے گا" ۔۔ ان صاحب نے یقین دلایا کہ وہ ابھی تیاری کر کے بیوی بچوں کے دلّی چلے جائیں گے ۔۔۔ اس کے ایک ہفتہ بعد کا ذکر ہے میں چچا کے کمرے میں گئی تو وہ ایک خط پڑھ رہے ۔۔ ... لگے۔

"دیکھئے وہ ہمارے دوست ہیں نا ــــ اب ان کے پاس حیدرآباد کا اسٹیشن صاف نہیں آتا ــــ" میں نے کہا پھر آپ کیا جواب دے رہے ہیں" تو بولے۔ "اب ان کو واپسی جواب دے رہا ہوں کہ مع فیملی کے حیدرآباد واپس چلے آیئے"ــــ

چچا کو لڈو بے حد پسند ہیں ــــ ایک بار لڈو بیچنے والا ٹھیلہ محلہ سے چلا کتا ــــ چچا نے رکوالیا ــــ کھڑکی میں خود کھڑے ہیں اور نوکر بھاؤ تاؤ کر رہا ہے ــــ بھاؤ پوچھا تو ڈھائی روپیہ سیر بتایا ــــ غصّہ میں لال پیلے ہو کر بولے "ڈھائی روپے سیر ــــ؟ پرسوں میں خود دو روپے آٹھ آنے سیر لایا ہوں ــــ بازار کا فاصلہ ہی ایسا کتنا ہے جو اتنا بھاؤ بڑھا دیا" ــــ اب نوکر بیچارہ سر پٹک رہا ہے لیکن چچا کی دھاندلی ختم نہیں ہو سکتی ــــ دینے والا سمجھ گیا کہ کسی عقلمند سے سابقہ پڑا ہے مسکرا کر بولا "اچھا جانے دیجئے صاحب دو روپے آٹھ آنے سیر لے لیجئے ــــ" چچا نرم پڑ کر بولے "اب کی بار تو لے لیتا ہوں غریب سمجھ کر چھوڑ دیا ــــ لیکن آپ سے دو روپے آٹھ آنے سیر کی چیز ڈھائی روپے سیر نہیں لوں گا ... میرے پیروں میں ابھی اتنا دم باقی ہے کہ بازار سے خود ہی دو روپے آٹھ آنے سیر لے آؤں"

ہمارے چچا رات دن اسی قسم کی سینکڑوں "عقلمندیاں" کرتے رہتے ہیں۔ اگر تم بھی مزہ لینا چاہو تو مجھے کھلونا کی معرفت لکھو۔

ہمارے چچا کتنے عقلمند ہیں۔ یہ بات اب محتاج بیان نہیں رہی ـــــ مگر سوچ رہی ہوں کہ چچا کے اِس "کارنامے" کو سُن کر تم یہ نہ کہہ دو کہ میں ان کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔

بھائی جان ام۔ اے پاس ہوئے تو ان کے دوستوں نے پارٹی مانگی۔ پارٹی کے دن بڑی گڑبڑ ہوتی رہی۔ بے چارے چچا نے بھی بہت کام کیا اور دوڑ دوڑ کر ہر چیز لاتے رہے۔ (اور اس سلسلے میں اپنے لنگڑے پن کو بھی بھول گئے!) شام کو جب میزوں پر تمام چیزیں سجائی جانے لگیں تو مجھے اکدم خیال آیا کہ اور تو سب کچھ منگوایا گیا ہے مگر سنگتروں کا پتہ نہیں ـــــ بھائی جان نے نوکر کو جلدی سے دوڑانا چاہا تو ہمارے چچا نے اپنی خدمات پیش کر دیں ـــــ چلتے چلتے میں نے یوں ہی کہہ دیا ـــــ "چچا سنتے ہیں ناگپور کے سنگترے بہت اچھے ہوتے ہیں"۔ "آدھا گھنٹہ ـــــ پون گھنٹہ ـــــ ایک گھنٹہ اور پھر ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ مگر چچا اب آتے ہیں نا تب ـــــ مجبوراً بغیر سنگتروں کے پارٹی دے دی گئی ـــــ چچا رات کو بھی واپس نہ آئے ـــــ البتہ دوسرے دن دوپہر کے تقریباً بارہ بجے ناگپور سے ان کا ایکسپریس تار آیا۔

"سنگترے لے کر پہنچ رہا ہوں ـــــ میرا انتظار کرو۔"

بھائی جان کے دوستوں میں ایک شاعر بھی ہیں جو "بے زبان"

تخلص کرتے ہیں ـــــ ایک دن بے دل صاحب آئے تو پہلے چچا انھیں بڑے غور سے دیکھتے رہے پھر سنجیدگی سے بولے۔

"کیوں صاحب، کیا آپ کے واقعی دل نہیں ـــــ؟"

ہمارے چچا کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہمیشہ ٹیڑھی بحث کرتے ہیں۔ آپ لاکھ سر پٹکیے وہ کبھی اپنی ہار نہ مانیں گے ـــــ ایک دن کتوں پر بات چھڑ گئی۔ سب اپنی اپنی باتیں سنانے لگے ـــــ بھائی جان بولے۔

"میں نے علی گڑھ میں ایک انگریز کے پاس ایک کتا دیکھا جو بکری کے اتنا بڑا تھا ـــــ سب حیرت کرنے لگے۔ میں نے سوچا میں کیوں چپکی رہوں۔ ـــــ میں بھی بول پڑی۔

"میں نے تو یہیں حیدر آباد میں اتنا بڑا کتا دیکھا کہ....."

مگر ابھی میری بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ہمارے چچا بول اُٹھے۔

"ارے تم بچے لوگ کیا دیکھو گے۔ میں نے یہیں سالار جنگ کی کوٹھی کے پھاٹک پر اتنا بڑا کتا دیکھا کہ گائے بھی اس کے سامنے چھوٹی نظر آئے ـــــ"

سب بچے تو اس کتے کے تصور ہی سے دم مار کر بیٹھ گئے۔ مگر میں اور بھائی جان نہ مانے۔ میں بولی۔

"تو چچا اصل بات یہ ہو گی کہ وہ کتا نہیں گائے ہی ہو گی!"

اک دم چچا کو غصہ آگیا۔ فوں فوں کرنے لگے! بولے۔ "تو کیا میں جھوٹا

ہوں، اچھا علو اسی وقت نہ بتا دوں تو نام پلٹ دینا میرا۔"

رات کے تقریباً آٹھ نو بج رہے تھے اور سالار جنگ کی کوٹھی یوں بھی اجاڑ سی جگہ واقع ہوئی تھی — سب ڈرنے لگے تو چچا کی اور ہمت بڑھی مگر بھائی جان نے ٹارچ ہاتھ میں لی اور ان کی دیکھا دیکھی سبھی بچے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب مزے سے چلتا ہوا یہ قافلہ سالار جنگ کی کوٹھی تک پہنچا۔ دور سے ہی ہم لوگوں کے اوسان خطا ہو گئے — چچا نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ خوب اونچا پورا عام گائے کی جسامت سے بھی بڑا کتا بھوں بھوں بھونک رہا تھا۔ چچا نے فتحمندی سے اکڑا! — "میں نہ کہتا تھا"؟ بھائی جان نے انھیں روک دیا — "لیکن یہ اندھیرے کی بات تھی لیجئے اب اجالے میں بھی دیکھ لیجئے!" اور یہ کہہ کر بھائی جان نے ٹارچ کی روشنی کتے پر پھینکی! پھاٹک پر خوب بڑی سی گائے بندھی کھڑی تھی اور اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی — !!

سب نے اکرم چچا کو قائل کرنا چاہا مگر چچا وہاں سے غائب تھے! اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزر چکا ہے مگر چچا کا اب تک پتہ نہیں غالباً اپنی شرمندگی مٹانے بڑے چچا کے یہاں چلے گئے ہیں۔

(۲)

ہمارے چچا بچپن میں بڑے فرماں بردار قسم کے بچے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا کچھ لنگڑے ہیں — بات کچھ بھی نہیں شاید دادا ابا نے

بھی کہہ دیا تھا کہ " ہمیشہ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرو ـــــ " تھوڑے ہی دنوں بعد ایک دن دادی اماں نے دیکھا کہ چچا لنگڑاتے چلے آرہے ہیں۔ پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ " آج ماسٹر صاحب موٹر سائیکل پر سے گر پڑے اور ان کا پیر ٹوٹ گیا۔ آبا نے کہا تھا استاد جیسا بننے کی کوشش کرو۔ میں بھی جھاڑ پر چڑھ گیا اور جان بوجھ کر گر پڑا ! " اور اس طرح " استاد جیسا بننے " کی کوشش کو انہوں نے پورا کر دکھایا۔ آج بھی ہمارے چچا کا کہنا ہے کہ شاگردوں کو ان سے سبق لینا چاہئے ! (جو جو شاگرد پڑھ رہے ہیں خبردار ہو جائیں!)

ہمارے چچا بے حد عقل مند ہیں۔ ایک دن چچا کے کسی دوست کے تین سالہ بچے کا انتقال ہو گیا۔ چچا بھی میت میں تشریف لے گئے ـــــ وہاں قبر کی کھدائی پر، کھدائی کرنے والے سے کچھ تو تو میں میں ہونے لگی۔ ہمارے چچا کو لوگوں کے جھگڑے نپٹانے میں بہت مزہ آتا ہے گورکن سے بولے " کیوں جھگڑ رہے ہو بھئی ـــــ سیدھی طرح قبر کیوں نہیں کھودتے ـــــ "

گورکن بولا ـــــ " واہ صاحب ـــــ جھگڑے کی بھی ایک ہی رہی ـــــ اتنی قبر کے پانچ روپے بھی نہ مانگوں ـــــ ؟ چچا صلح کے انداز سے بولے ۔" ارے بھائی جانے دو ـــــ بڑا بچہ مرے گا تو بڑی قبر کے پیسے بھی دیں گے۔ اب تو تین ہی کا کام کر دو "

ننھے میاں ہر ہفتہ واری امتحان میں دھڑا دھڑ فیل ہو رہے تھے رپورٹ آتی اور بڑا تعجب ہوتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ —— ایک دن بھائی جان نے ننھے کے کان اینٹھے "کیوں رے —— اس طرح لڑھکتا رہا تو سالانہ امتحان میں کیا کرے گا؟" پتہ چلا کہ ننھے میاں کو پڑھانے کا سارا بار چچا نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اور جناب کچھ یوں پڑھاتے ہیں

سوال۔ الف، ب اور ج ایک کام تین دن میں کرتے ہیں تو د اسی کام کو کتنے دن میں کرے گا؟

جواب۔ د کہتا ہے تین تین آدمیوں کا کام اکیلا کیسے نبٹا ڈالوں۔

سوال۔ حامد اور محمود ۵ کوس کا چکر ۱۰ منٹ میں لگاتے ہیں تو احمد اکیلا کتنی دیر میں لگائے گا؟

جواب۔ حامد اور محمود کے پاس سائیکل ہوگی احمد جواب دینے سے معذور ہے —— اس کے ابا سائیکل دلادیں گے تب بات بنے گی! ننھے میاں کا نتیجہ ظاہر تھا —— !!

ہمارے چچا میں اور جہاں کئی "خوبیاں" ہیں وہیں ایک یہ بھی ہے کہ کسی نئے ملاقاتی سے اور خصوصاً وہ سوٹ پہنے ہو تو بہت مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس وقت اتنے بدحواس ہو جاتے ہیں کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتی ہے! ایک دن بھائی جان نے اور میں نے پروگرام بنایا کہ چچا کو ڈاکٹر داس

کو دکھایا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی چچا بوکھلا گئے ـــــ ڈاکٹر صاحب ہمارے پروگرام میں پہلے ہی شامل کر لئے گئے تھے۔" سچ ـــ سچ "ڈاکٹر صاحب نے چچا کو دیکھتے ہی افسوس شروع کیا ـــــ "بالکل خراب صحت ہے ـــــ کسی اونچے مقام پر جانا چاہیئے آپ کو ـــــ !" پھر بولے ! "ناشتہ میں آپ نے کیا کھایا تھا ـــ؟"

"جی ـــ جی ـــ چچا سٹ پٹا کر بولے ـــ" مرغی نے میرا انڈا کھایا تھا ـــ ڈاکٹر صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا ـــ اُسی شام کا واقعہ ہے۔ میں چچا کے کمرے میں پہنچی تو دیکھا انہماک سے اپنا بستر پلنگ پر بچھا رہے ہیں! (واضح رہے چچا زمین پر سونے کے عادی ہیں!) مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ خلاف عادت حرکت کیسی ـــ میں نے پوچھا ـــ" ارے چچا آپ پلنگ پر تو کبھی نہیں سوتے ـــ؟" ـــ بولے ڈاکٹر صاحب نے صبح کہا تھا کہ" اونچے مقام پر جانا چاہیئے!" (مطلب یہ کہ پلنگ" اونچا مقام" تھا!) ابھی کچھ دنوں بڑے زور شور سے چچا کی شادی کی بات چل نکلی کہیں رکھو کہیں چھپی؟ چچا امی نے آپ کی دلہن کے لئے زیور آ بنوا رکھے ہیں۔ ایک دن بہت شرماتے شرماتے بڑی چچی کے پاس گئے "بھابی جان میں نے سنا ہے آپ نے دلہن کیلئے بہت سارا نورمنٹ بنوا رکھے ہیں۔"

"ارے چچا اورنامنٹ کے معنی تو گہنے ہوتے ہیں۔ آپ کہنا کیا چاہتے تھے تو" اورنمنٹ کہنے ـــ" اندر ولی ـــ چچا کو بہت غصہ آیا کہ سب ہی ان کا مذاق اڑا رہے ہیں چچی اماں بچوں کے ساتھ ہنسی اڑانے پر تل گئیں!! بس آج کل چچا نے اسی سلسلے میں بات چیت بند کر

چچا اور ٹیلی فون

دو سال قبل، جب تک کہ ہمارے ہاں ٹیلی فون نہیں لگا تھا، ہمارے چچا سے ہمارے تعلقات کس قدر خوشگوار تھے!! اب نہ ہی پوچھئے تو بہتر ہے۔ "کھلونا" پڑھنے والے بھائی بہن "ہمارے چچا" کو بھولے تو نہ ہوں گے۔ یہ وہی چچا ہیں بچّو جنھیں خرابیٔ صحت کی وجہ سے ڈاکٹر نے کسی بلند مقام پر جانے کا مشورہ دیا تھا تو وہ بجائے فرش کے پلنگ پر سونے لگے تھے، (اپنے حسابوں وہ بلند مقام پر پہنچ گئے تھے۔) ایک بار کسی سالگرہ پارٹی میں ان سے فرمائش کی گئی کہ فوراً بازار جائیں اور ناگپوری سنترے لے آئیں تو چچا محترم حیدرآباد سے ناگپور روانہ ہو گئے اور وہاں سے تار دیا۔ "سنترے لے کر پہنچ رہا ہوں انتظار کرو"

پچھلے چند سالوں سے چچا سے تعلقات ذرا کشیدہ چلے آرہے تھے، لیکن اتنے بھی نہیں کہ اسے "قطع تعلق" کا نام دے دیا جاتا۔ تعلقات کشیدہ ہونے کی وجہ بھی سُن لیجئے، چچا کی شادی کا رقعہ اُن دنوں وصول ہوا جب سب ہی کے سالانہ امتحانات جاری تھے۔

کوئی جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے سوچا گیا کہ تار ہی دے دیں۔ بھائی جان کے سر پر ذمہ داری سونپی گئی۔ پتہ نہیں تار گرنے والے کلرک کی بھول تھی یا بھائی جان کی شرارت۔ تار اس مضمون کا چلا گیا "خدا کرے یہ دن آپ کی زندگی میں بار بار آئے۔"

پتہ چلا کہ اس تار کو پاکر چچا بے حد چراغ پا ہوئے اور ان سے زیادہ نئی نویلی چچی بھنائیں ـــــ بعد میں جب ایک ملاقات میں چچا نے ممی کے سامنے شکایت کی تو بھائی جان دبی زبان سے بولے۔

"چچا مجھے اپنی غلطی پر سخت افسوس ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تار اگر غلط تھا تو بھی یہ سعادت خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔"

بہرحال یہ بات تو یوں ہی بیچ میں آگئی۔ اصل قصہ یہ تھا کہ ساری گڑبڑ شروع سے فون نے پیدا کی ـــــ ہوا یہ کہ جیسے ہی ہمارے ہاں ٹیلی فون لگا کالونی میں پہلا فون ہونے کی وجہ سے سب کے لئے تماشا ہو گیا۔ تماشے کی منزل سے گزرنے کے بعد لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ آفس سے گھر، گھر سے ہاسپٹل، اسٹیشن، ایرپورٹ، کتنی جگہیں ایسی ہیں جہاں سے بیٹھے ہی بیٹھے کام آسان کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ "اہل فون" پر کیا گزرتی ہوگی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ پاس پڑوس کے سب ہی لوگوں نے اپنے اپنے پاکٹ میں ایک چھوٹی سی چٹ پر ہمارا فون نمبر لکھ لیا ـــــ

فون کرنے کے لئے آنے والوں کا تو پوچھئے ہی مت۔ باقاعدہ کیو لگنے لگے ـــــ گھر بیٹھے کال بھی اتنے آنے لگے کہ ہمیں باقاعدہ ایک نوکر رکھنا پڑا جس کا کام ہی صرف یہ تھا کہ وہ پاس پڑوس سے جس کسی کا کال آئے، بُلا بُلا کر لاتا رہے۔ اپنا ہی گھر اجنبی لگنے لگا ـــــ (ہمارے خیال میں مشہور شاعر ن م راشد نے اپنی نظم "وطن میں اجنبی" اسی صورتِ حال سے مجبور ہو کر لکھی ہوگی۔ بہرحال) کبھی کبھار نوکر تھک کر سو جاتا تو کال ریسیو کرنے کی مصیبت ہمارے سر آتی۔ کال کچھ اس قسم کے ہوا کرتے۔

"دیکھئے فلیٹ نمبر ۵ میں جا کر کہہ دیجئے کہ ان کی مسز کے خیریت سے لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔"

"فلیٹ نمبر ۶ میں کہلوا دیجئے کہ ٹرین آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ نو کی بجائے ساڑھے نو بجے گھر سے نکلیں۔"

"دیکھئے آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن ذرا فلیٹ نمبر ۴ میں جا کر دیکھ لیجئے اور آ کر بتائیے کہ دادا جی کا بلڈ پریشر اب کتنا اور کیسا ہے؟"

"دیکھئے آپ کے سامنے والے فلیٹ میں جو ہم لوگ رہتے ہیں نا۔ آپ پہچان گئیں نا۔ ہم وہی لوگ ہیں تو پلیز اتنا کر دیجئے کہ مسز سے جا کر کہہ دیں کہ....."

پہلے پہلے تو میں نے بہت کرٹسی (اخلاق) دکھائی۔ پھر فون کرنے

والوں کو کچھ اس طرح کے جواب ملنے لگے۔

"دیکھئے آپ کے بازو والوں کے ہاں ڈیلیوری ہونے والی تھی ـــــ تو کیا ہوا"

"جی لڑکا پیدا ہو گیا (بغیر کسی معلومات کے) اور جو بھی جس بھی ہاسپٹل کا نام اور پتہ یاد آگیا بتا دیا ـــــ بعد میں فون آتا۔

"بھئی آپ نے کہا تھا لڑکا پیدا ہوا۔ وہ تو لڑکی نکلی ـــــ"

میرا جواب ہوتا "تو کون سی آفت ٹوٹ پڑی۔ میرے خود بھی ایک لڑکی ہے ـــــ میں تو ایک لڑکی کی ماں بن کر بے حد خوش ہوں"

کبھی فون آتا۔ "پڑوس والے چاچا جی کی رات طبیعت بیحد خراب تھی اب کیسی ہے"

"جی بڑے افسوس کی بات ہے، لیکن موت حیات سب خدا کے ہاتھ ہے"

پھر تھوڑی دیر کے بعد گھنٹی بجتی "کمال ہے آپ جھوٹ بھی کہتی ہیں۔ چاچا جی تو بھگوان کے کرم سے زندہ ہیں"

میرا جواب تیار تھا "دیکھئے اتنے زمانے سے اُن کی بیماری کے تعلق سے فون آرہے ہیں کہ قاعدے سے تو اب تک انھیں مر ہی جانا چاہئے تھا، لیکن لگتا ہے بہت "حیادار" ہیں۔

اور ماجرا سارا یہ تھا کہ وہ صاحب جن کے تعلق سے دن بھر میں کئی کئی

فون آنے لگے تھے صرف نزلے زکام کے مستقل مریض تھے لیکن بیماری کی پبلسٹی سے وہ بے حد خوش ہوتے تھے

افوہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ایک دن میں پتہ نہیں کس دُھن میں تھی کہ فون کی گھنٹی بجی اور میں نے بے خیالی میں ریسیور اُٹھا لیا ــــ اُدھر سے بڑی غمگین آواز آئی۔

"دیکھئے چچا کا آج رات انتقال ہو گیا..... اور بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ میرا ذہن سب سے ہٹ کر سیدھا ہمارے چچا کی طرف چلا گیا ــــ لے ہے اس قدر اچانک موت پھر میں نے کچھ نہ سُنا ــــ اسی لمحہ تار گھر سے لائن ملائی اور چچی کے نام تعزیت کا تار کر دیا۔

اب میرے خیال سے سُنانے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی ــــ تین چار دن بعد جب ٹیکسی سے چچا چچی اُترے تو مزید ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کیونکہ ہمارے حسابوں تو چچا نہ صرف مر چکے تھے بلکہ اب تک تو منکر نکیر نے ان کا "تیا پانچا" بھی کر دیا ہو گا۔ اس حساب سے تو وہ بھوت ہی ٹھہرے نا ــــ انھیں دیکھتے ہی جب بچوں نے بھوت، بھوت کے نعرے لگانے شروع کئے تو اب آپ خود سوچ لیں کہ گھر میں کیسی قیامت مچی ہو گی۔ چچی الگ رو رو کر دہائی دے رہی تھیں کہ

"مجھ جان جوان سہاگن کو جیتے جی بیوہ بنا ڈالا"

چچا سے تعلقات اتنے خراب ہوتے بھی نا۔ لیکن چچی کے یوں دہائی

دینے پر بھائی جان نے بس اتنا کہہ کر آفت مول لے لی کہ "بچی ڈھونڈ سے ایک بھی کالا بال تو آپ دونوں کے سر میں نظر نہیں آتا، ان حالات میں تو خدا کو آپ دونوں ہی پیارے لگ سکتے ہیں"

بس وہ دن اور یہ دن ـــــ چچا سے تعلقات بالکل ختم ہو کر رہ گئے ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر چچا سے تعلقات خراب ہو جانے کا بیحد غم ہے کیونکہ چچا ہی وہ واحد ہستی تھے جو ہمیں ایک سے ایک عجوبہ دکھایا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار اپنے گاؤں میں انھوں نے رات کے اندھیرے میں ایک بیل جتنا بڑا کتا دکھایا تھا (جس پر بھائی جان نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو پتہ چلا کہ وہ سچ مچ بیل ہی تھا)

یہ ساری مصیبت چونکہ ٹیلی فون کی لائی ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے ٹیلی فون رسیو کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

———— ※ ————

تصویر

پھوپھا میاں کو کتوں سے وہ بیر تھا کہ خدا کی پناہ — جہاں کبھی محلے کے کتے نے بھولے بسرے گھر میں پاؤں رکھ دیا اور ان کے مزاج گئے — پاس کے گھر میں موتی نام کا ایک بڑا پیارا سا کتا تھا۔ وہ جانے انجانے میں کبھی ہمارے گھر میں گھس آتا تو پھوپھی بی اسے بڑے پیار سے گوشت کا ٹکڑا یا روٹی کا ٹکڑا کھلا دیتیں۔ یہ نہیں تو ہڈی ہی سہی۔ موتی صاحب کی بڑی ساری فیملی تھی۔ موتی تازی بیگم صاحبہ تھیں اور دو چار موٹے تازے بچے —

ایک دن بازو والی خالہ جان نے تنگ آ کر کتیا کے بچوں کو پھنکوانا چاہا تو ہمارے گھر میں طوفان سا آگیا — سارے بچے اور خود پھوپھی بی کی رائے تھی کہ ایک پلا اپنے گھر کے لئے لے لیا جائے اور پھوپھا میاں کا یہ حال تھا کہ مارے غصّے کے پھنکے جا رہے تھے۔

"یا تو کتا گھر میں رہے گا — یا میں — دونوں کا رہنا محال ہے"

چار برس کے ٹِلّو میاں باپ سے ڈرے بغیر بولے — "تو پھر آپ چلے جائیے کتے کو رہنے دیجئے —"

چھوچھا میاں نے دیدے گھما گھما کے صاحبزادے کی بات سُنی اور پھر بھیر کر بی بی سے بولے ــــ

"کچھ سُنا صاحبزادے کیا فرما رہے ہیں۔ یہ بس تمہاری وجہ سے بگڑے جا رہے ہیں ــــ بھلا کوئی باپ کو یوں کہا کرتا ہے ــــ"؟

چھوپی بی ہنسی روک کر بولیں ــــ "لے ہے بچہ ہی تو ہے ــــ آخر کیا قصور کر دیا۔"

مگر چھوچھا میاں کے تیور یونہی رہے ــــ اور اب تو وہ کسی حالوں اجازت دینے پر راضی نہ تھے ــــ مگر کتّا پالنا بھی ضروری تھا۔ اب سب نے باری باری کتّے کی شان میں قصیدے پڑھنے کی ٹھانی ــــ

"چور اچکّوں کا زمانہ ہے۔ کتّا رہے تو بے فکری ہی بے فکری۔ نہ چوکیدار کی ضرورت نہ دربان کی ــــ"

"اور جناب کا کام کتنے کرتا ہے۔ رشید چچا کے پاس جو کتّا ہے وہ اُن کے جوتوں پر پالش کرتا ہے ــــ"

"ہاں ہاں یہ کیوں نہیں کہتے کہ ان کے ہاں کی کتیا کھانا پکاتی ہے۔"

چھوچھا میاں چڑ کر بولے ــــ

"آپ غصّہ سے کہہ رہے ہیں مگر یہ حقیقت ہے جناب ــــ سدھائے ہوئے کتّے اس سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں۔" چچا میاں ہنس کر بولے ــــ

" ہمارے ہاں ماشاءاللہ بہت سارے نوکر ہیں ـــ کتے کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی جائے ـــ" پھوپھا میاں رکھائی سے بولے ـــ

" اے توبہ ـــ، ایسی بھی کیا ڈھٹائی، ذرا بچوں کا دل رکھنا نہیں جانتے۔ بھلا آپ کا کیا جاتا ہے کتا رکھ لیں تو ـــ" پھوپھی بی اُلجھ کر بولیں ـــ

" بہت ناپاک جانور ہوتا ہے۔ برتنوں میں منہ ڈالے گا۔ باورچی خانے کی سیر کرے گا ـــ اور ....."

" ہم اس کو زنجیر سے باندھ کر رکھیں گے۔ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں ـــ اور پھر اتنی چیخ و پکار مچی کہ پھوپھا میاں ہار مان گئے ـــ مگر غصہ ابھی تک اترا نہ تھا ـــ بولے ـــ

" اور جو کبھی میرے کمرے کے پاس پھٹکا تو، تو ایک دم شوٹ کر دوں گا ـــ" ننھا سا پلا پیوں پیوں کرتا ہوا ہمارے گھر آگیا۔ سب کے صلاح و مشورے سے "ٹابی" نام رکھا گیا ـــ ٹابی میاں کی شان نرالی تھی۔ سب کے لاڈ دلار نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا ـــ گلے میں گھنگھرو۔ پیٹھ پر جھولنا ـــ پیروں میں جھنک جھنک چھاگلیں ـــ وہ لاکھ چڑ کر زیور اتارنا چاہتے مگر کوئی اتارنے نہ دیتا ـــ گھر کے کونے میں نیم کے پیڑ سے ان کی زنجیر بندھی رہتی۔ بیچاروں کو کہیں آنے جانے کی آزادی نہ تھی۔ اور پھوپھا میاں کے کمرے کی سرحد سے تو وہ یوں بچائے جاتے کہ بس ـــ اب جناب ان کو اچھی اچھی باتیں سکھائی جانے لگیں۔

کوئی گیند دور تک پھینک دیتا اور ٹابی میاں اٹھالاتے ـــ مہمانوں سے وزیٹنگ کارڈ لے کر بھائی جان کو لاکر بتاتے ـــ مہمان جانے لگتے تو ایک ٹانگ سے سلام جھاڑتے ـــ بڑی کوششوں سے ان کو دروازے کی زنجیر کھولنا سکھایا گیا ـــ اگر کوئی پوچھتا ـــ

"کیوں بھئی ٹابی میاں ـــ ڈرائنگ روم کدھر ہے ـــ" تو وہ آگے آگے بھاگے جاتے اور عین ڈرائینگ روم کے سامنے رک جاتے اور تو اور انھوں نے ایک بار ایک چور بھی پکڑ دکھایا ـــ ہوا یوں کہ محلے کے کوئی صاحبزادے اپنی قمیض کے دامن میں ہمارے ہاں کا مرغی کا بچہ چھپائے بھاگ رہے تھے کہ ٹابی میاں نے عین موقع واردات پر جالیا۔ ہر کس و ناکس کی زبان پر ٹابی میاں کے چرچے ! غرض وہ اچھے خاصے "ہیرو" بن کر رہ گئے۔

مگر پھوپھا میاں کی تیوری سے بل ابھی بھی نہ اترے۔ وہ ہر لمحہ اسی تاک میں رہتے کہ ٹابی میاں کو نیچا دکھانے کا موقع مل جائے۔ مگر وہ بھی ایسے چالاک کہ کبھی مالک کو شکایت کا موقعہ نہ دیا ـــ روز پانچ بجے جب پھوپھا میاں آفس سے واپس آتے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے دم ہلا ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے مگر ذرا قریب نہ پھٹکتے ـــ صبح جب پھوپھا میاں آفس جاتے تو خوشی خوشی پھاٹک تک آتے ـــ پھوپھی بی کو اب سچ مچ یوں اطمینان ہو چکا تھا جیسے گھر میں کوئی بڑا بوڑھا آگیا ہو ـــ

مزے کی بات یہ تھی کہ بچے شام کو سیر کے لئے جاتے تو خود ٹابی میاں ان کی نگرانی کے لئے ساتھ ہو جاتے ـــــ یہ تو خیر ان کا معمول تھا کہ جو بھی باہر جائے اس کا ساتھ دیں۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ گھر کا خیال بھی انھیں لگا رہتا۔

کبھی کبھار پھوپھی بولتیں ـــــ

"خواہ مخواہ منہ پھلائے رہتے ہیں۔ بھلا بتایئے تو ٹابی نے اب تک آپ کا کوئی نقصان کیا ـــــ"؟

پھوپھا میاں ہٹ دھرمی سے جواب دیتے ـــــ" اور مجھے تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ خواہ مخواہ سب گرویدہ ہو کر رہ گئے ہیں ـــــ"

ایک بار جاڑوں کے دن تھے ـــــ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، سارے گھر میں گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا ـــــ پھوپھا میاں کہاں تو پانچ بجے ہی آفس سے لوٹ آتے تھے، یا اب دس بجنے کے باوجود بھی آنے کا پتہ نہ تھا؛ ٹابی رہ رہ کر پھاٹک پر جاتا اور پھر اپنے کھونٹے پر آکر بیٹھ جاتا ـــــ بڑی دیر تک وہ اسی طرح بے تاب رہا اور پھر آخر کار بڑی بڑی آوازیں نکال کر رونے لگا۔ جھونکے جھونکتے وہ اٹھا اور چھلانگ لگا کر باہر دوڑ گیا ـــــ"

رات کے دس گیارہ بجے ہم سب گہری نیند میں تھے کہ اک دم کسی غیبی طاقت سے مجبور ہو کر جاگ پڑے ـــــ برآمدے میں لائٹ جل رہی تھی ـــــ ہم سب دوڑ کر باہر آئے تو دیکھا پھوپھا میاں

کے کپڑے خون سے تر بتر ہیں اور سامنے ٹابی کی لاش پڑی ہے ۔۔۔

وہ دھیرے دھیرے پھوپھی بی سے کہہ رہے تھے ۔۔۔

" چوروں نے اندھیرے میں اکیلا پاکر مجھے گھیر لیا ۔ ایک پستول تانے میرے سینہ پر کھڑا رہا اور ایک جیبوں کی تلاشی لیتا رہا میرا کام! یوں تو سارے نو بجے ہی ختم ہو گیا تھا ۔ اتنی رات گذری بھی نہ تھی کہ چوروں کا خوف ہوتا اگر بارش کی وجہ سے راستہ میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا ۔ لائٹ کے فیوز اڑ گئے تھے ۔۔ میں یوں ہی دم سادھے کھڑا رہا تھا ۔ ہاتھ پیروں میں ذرا بھی طاقت نہ رہ گئی تھی، اتنے میں مجھے پیروں کے پاس گیلا گیلا سا محسوس ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ چور تیورا کر زمین پر گر پڑا جس نے پستول تھام رکھا تھا ۔ کسی چیز نے اسے کاٹ لیا تھا ۔" !!

پھوپھا میاں نے غم بھری آنکھوں سے ٹابی کی طرف دیکھا ۔۔۔

" میں سمجھ گیا یہ اور کوئی نہیں، بس ٹابی ہے ۔۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اک دم دوڑ کے جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا دوسرے چور نے غالباً اپنا نشانہ ٹابی ہی کو بنایا! دیکھ ساری جلن کتنے پر اتاری اور غریب بے زبان ٹابی دو گولیاں کھا کر یہیں تمام ہو گیا۔"

اب جب کبھی پھوپھا میاں کے دوست ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی ایک کتے کی تصویر دیکھتے ہیں تو حیرت سے پوچھتے ہیں ۔" ارے میاں ۔ تم تو کتوں سے اتنی نفرت کرتے تھے ۔ یہ ناپاک جانور کی تصویر کیوں اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے ۔"

پھوپھا میاں کچھ جواب نہیں دے پاتے، ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں ۔

پھولوں کا بادشاہ

بہت دنوں کا ذکر ہے۔
سردیوں کی بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ صحن میں ایک طرف امّی نے موتیا کے پودے قطار سے لگا رکھے تھے۔ کہ ایک دن لال پروں والی مرغی دانے دنکے کی تلاش میں پودوں کے نیچے جا پہنچی۔
"گلاب بیٹے ذرا مرغی کو وہاں سے نکال تو دو۔ پودے خراب کر دیگی"!
اب تو جناب امّی نے خود ہی ایک کام بتا دیا۔ گلاب میاں اٹھے اور مرغی کے پیچھے لپک پڑے۔ مرغی تو ان کی تیز رفتاری سے ڈر کر آپ ہی آپ اڑ گئی اور خود گلاب میاں سیدھے موتیا کے پودوں پر جا گرے۔ جو ان کے وزن سے بُری طرح کچل کر رہ گئے۔ مرغی اڑی اور دیوار پر جا بیٹھی مرغی سے بدلہ لینا ضرور تھا۔ دیوار پر کبوتر اور کبوتری بھی پر پھڑپھڑاتے بیٹھے تھے۔ انھوں نے تک کر پتھر جو مارا تو بجائے مرغی کے کبوتری کے جا لگا اور بے چاری کے ماتھے پر چوٹ لگ گئی۔ مرغی تو پھر بھی وہیں ٹکی ہوئی تھی۔ انھوں نے دوسرا پتھر تاکا جو مرغی کو لنگڑاکر تا ہوا

دیوار کے پار جا گرا۔

اُدھر دیوار کے پار پڑوسن خالہ جان کی بیٹی چنی بیٹھی گڑیا کھیل رہی تھی۔ پتھر اچھل کر اس کے سر پر جا لگا، اور خون کی دھار نکل پڑی۔ وہ تلملا کر جو پلٹا گیں تو سامنے سے ماما کریمن ہاتھوں میں چائے کی طشت سنبھالے آ رہی تھی۔ چنی جو ماما کریمن سے ٹکرائی تو دھر جلتی ابلتی چائے اس کے ہاتھوں پیروں پر گر پڑی۔ اور طشت اس کے ہاتھ سے چھوٹ گرا سارے برتن برباد ہو گئے۔

کچلے ہوئے پودے۔ چوٹ کھائی ہوئی کبوتری۔ لنگڑی مرغی۔ جلی ہوئی ماما کریمن اور چینی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جب امی کی خدمت میں حاضر کئے گئے تو مارے شرمندگی کے ان کے منہ سے بات بھی نہ نکل سکی۔

"گلاب، میں نے تم سے کیا کہا تھا؟"

"جی، آپ نے کہا تھا مرغی ہنکال دو۔"

"اور تم نے مرغی یوں ہنکالی کہ ساری دنیا میں ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ـــ نا ـــ" انہوں نے غصے سے گلاب کی طرف دیکھا اور بپھر [illegible] لگیں۔

"تمہاری شرارتوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ روز نئی نئی شکایتیں تمہارے متعلق آتی ہیں۔ اب میں تم سے عمر بھر بات نہ کروں گی! کتنے بے زبان جانوروں کو تم نے ستایا ہے؟ ادھر دیکھو بیچارے وہ ننھے منے مونیا

کے پودے؟ ان پر کیا گذری ہوگی بھلا۔؟"

"پودوں میں بھی جان ہوتی ہے امّی؟" گلاب میاں حیرت سے بولے۔

"کیوں نہیں ہوتی۔؟" یہ لہلہاتے پودے جاندار ہی تو ہوتے ہیں ذرا بارش زور سے پڑ جائے۔ پالا پڑنے لگے یا اولے گرنے لگیں۔ زمین پر گر جاتے ہیں۔ پھر کبھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہی تو ان کی موت ہوتی۔ مگر آج تو بارش ہوئی نہ پالا پڑا۔ اولے گرے نہ بجلی گری اور تم نے ان معصوموں کو مار ڈالا۔ کبوتری اچھی ہو جائے گی۔ مرغی دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ چنّی کا زخم بھر جائے گا۔ ماما کرمین تندرست ہو جائے گی۔ چائے کا نیا سیٹ بازار سے آجائے گا۔ مگر ان پودوں کو زندگی کہاں سے ملے گی۔؟ تم کس قدر شریر ہو گلاب۔ تمہاری وجہ سے میں کتنی شرمندہ ہوتی ہوں۔" غم اور غصّے نے ان کی آنکھیں بھر رہی تھیں۔

دوپہری گزری۔ سہ پہری گزری۔ شام گزری اور صبح نکل آئی مگر امّی نے بات نہ کی۔ پہلے تو گلاب میاں مذاق ہی سمجھتے رہے مگر دو دن گذرنے پر بھی امّی نے بات ہی نہ کی بس علی بخش میز پر کھانا لگا دیتا اور آکر کہہ دیتا۔

"چھوٹے صاحب چل کر کھانا کھا لیجئے۔"

اب امّی پیار سے چمکارتی تھیں، نہ دلار کرتی تھیں۔ ہاتھ سے نوالے

بنا بنا کر کھلاتی تھیں، نہ گودی میں بٹھاتی تھیں۔ وہ ہی دن میں گلاب میاں مرجھا کر رہ گئے۔" امّی کا وجود اُن کے لئے کس قدر ضروری ہے" اس کا احساس اب انھیں امّی کی خفگی سے ہو گیا۔

میں امّی کو حتی الامکان خوش رکھنے کی کوشش کروں گا ــــ" انہوں نے طے کر لیا۔ مگر امّی کو تو اس قدر زوردار غصہ چڑھا تھا کہ اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

اب تو امّی دیکھتی تھیں کہ گلاب میاں بڑے سنجیدہ ہوئے جا رہے ہیں۔ اسکول سے آکر بستہ جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ وقت پر کھانا کھا، پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ نہ چنّی سے جھگڑتے نہ مرغیوں سے لڑتے۔ رات گئے تک اسکول کا کام کرتے رہتے ہیں۔ دراصل امّی کی خفگی نے ان کی شرارت کا مزہ چھین لیا۔ اب تو وہ بڑے مزے سے امّی کے کاموں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے ہیں۔ صحن میں اللہ جانے کا ہے کا ایک چھوٹا سا پودا تھا۔ دن گزر گئے مگر اس پر کوئی پھول نہ کھلا۔ مگر امّی اس کو روزانہ پانی دیتی تھیں کہ کبھی تو اس پر بھی پھول ہنسے گا۔ گلاب میاں نے اس کی ذمّے داری بھی اپنے سر لے لی۔

"بس اس پودے میں ایک اچھا سا پھول کھل جائے میں امّی کی خدمت میں وہی پھول تحفے کر جاؤں گا۔ اور کہوں گا۔" امّی! اب تو آپ نے معاف کر دیا نا۔ اب تو میں اچھا بچہ بن گیا نا ــــ؟"

اُس دن سرِ شام ہی بادل اُمڈنے لگے۔ سارے ماحول میں سیاہی پھیل گئی۔ ہواؤں میں اس قدر خنکی تھی کہ کلیجہ پھٹا جاتا۔ آثار بتاتے تھے کہ رات میں سخت بارش ہوگی یا پھر اولے گریں گے۔

گلاب اپنے بستر میں پڑا ہوا تھا۔ ہوا کی ٹھنڈی لپٹ آئی اور وہ کانپ کانپ اٹھا۔ ساتھ ہی امّی کی کہی بات اسے یاد آئی۔

"پالا پڑنے لگے یا اولے گرنے لگیں۔ یہ زمین پر گر جاتے ہیں۔ پھر کبھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہی تو ان کی موت ہوئی۔"

"میری امّی کا پودا مر گیا تو پھر پھول کیسے کھلے گا اور میری امّی کیسے جئیں گی۔ مجھے تو اچھا بچّہ بننا ہے کہ وہ معاف کر دیں ——!"

باہر اولوں کے ساتھ بارش شروع ہو چکی تھی

رات چڑھ چکی تھی۔ سارے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ گلاب بستر سے اٹھ کر اپنی ننھی سی ریشمی چھتری اٹھائی اور صحن کو ہو لیا۔ پودے کے پاس بیٹھ کر اس نے اپنی چھتری پودے پر پھیلا دی اور خود پانی میں بھیگتا رہا۔ پٹ پٹ اولے گرتے رہے اور گلاب کی ننھی نازک چھتری پھٹ گئی۔ گلاب کھڑا ہو گیا اور اپنی قمیص پودے پر یوں پھیلا دی کہ پودا بچا رہے۔ تھوڑی دیر میں قمیص کا حشر بھی چھتری کا سا ہو گیا۔

اولے اس بری طرح گر رہے تھے جیسے کسی نے صحن میں سفید سفید روئی بچھا دی ہو۔ گلاب کے دانت کٹ کٹا رہے تھے۔

پودا اب تک تو محفوظ تھا۔ مگر اب کیا ہوگا۔ امّی پیاری اب کیسے نہیں گی ــــ؟ گلاب دونوں ہاتھوں اور پیروں کے بل یوں کھڑا ہوگیا کہ اس کا پیٹ پودے کے لئے چھتری بن گیا اور پٹ پٹ اولے اس کی ننھی منّی پیٹھ پر برسنے لگے۔

صحن میں سفید روئی کی تہیں دبیز سے دبیز تر ہوتی گئیں۔!! صبح جب امّی صحن میں اتریں تو ان کے قدم برف میں ہی گڑے رہ گئے۔ کونے میں گلاب اکڑا پڑا تھا۔ ننگا بدن۔ ننگی پیٹھ۔ ہر طرف نیلے نیلے نشان۔ امّی کے منہ سے تو چیخ بھی نہ نکل سکی۔ خالی خالی نگاہوں سے اُنہوں نے پودے کو دیکھا۔ صحن کے اور دوسرے پودے تو اولوں کی تاب نہ لاکر زمین پر گر چکے تھے۔ مگر گلاب کا بچایا ہوا پودا اسی تازگی سے جھوم رہا تھا، اور آج کئی دن بعد پہلی بار اس کی اوپری ڈالی پر ایک بڑا سا تر و تازہ سُرخ سُرخ لہلہاتا پھول کھلا ہوا تھا ــــ!!

اُس دن سے وہ پھول، جس کا کوئی نام نہ تھا۔ پھولوں کا بادشاہ "گلاب" ٹھہرا۔ تم نے آزمایا ہوگا، جب امّی تمہارا دلار کرتی ہیں تو کہتی ہیں۔

"میرے لال ــــ میرے گلاب ــــ اچھے بچے شرارت نہیں کیا کرتے ــــ"

"اگر میں سائنسداں ہوتا تو کیا کرتا؟"

(دُنیا کے ہر ننھے بچّے کی خواہش)

جب میں نے اپنی ماں کی پیاری گود سے اتر کر پہلے پہل زمین پر چلنا سیکھا تو میرے چھوٹے چھوٹے قدم کمرے کے ایک کونے میں جا کر رُک جاتے۔ جہاں ریڈیو اپنی مدھر آواز سے پیارے پیارے گیت گا رہا ہوتا ــــ میں سر اُٹھا کر اوپر دیکھتا تو جگ مگ، جگ مگ لائٹ چمکتی پاتا ــــ شام کو ہمارے پورچ میں ہارن بجتا اور پاپا اپنی لمبی سی کار سے اتر کر گھر میں داخل ہوتے نظر آتے۔ ان کے آتے ہی ممی فوراً بجلی کے چولھے پر چائے تیار کرنے لگتیں۔ باتیں ہوتی رہتیں اور چائے کے دور چلتے رہتے۔ ریڈیو بجتا رہتا۔ میں حیرت سے یہ ساری چیزیں دیکھتا رہتا ــــ یہ مدھر آواز والا ریڈیو ــــ چمکنے والی لائٹ ــــ منٹوں میں یہاں سے وہاں پہنچا دینے والی موٹر ــــ دیکھتے ہی دیکھتے چائے تیار کر دینے والا بجلی کا چولھا۔ ہمارے گھر ٹی وی آیا۔ شیشے اور [illegible]

میری ممّی نے مجھے بتایا کہ یہ سب سائنس کی ایجادیں ہیں ـــــ میں سوچتا اور ننھے سے ذہن سے سوچتا ہی رہ جاتا کہ یہ سائنس کس قدر پیاری چیز ہے ـــــ زندگی اس کی بدولت کتنی آسان اور خوشگوار ہوگئی ہے ـــــ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا سائنس کی قدر و قیمت مجھ پر کھلتی گئی ـــــ اب وہ زمانہ آرہا تھا جب میں کاغذ کی ننھی چڑیا کے لئے ضد کرنے کی بجائے آسمان پر اُڑنے والے ہوائی جہاز کو دیکھتا اور سوچتا کتنی عظیم ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اس آسمان اور زمین کو بہت خوبصورت بنا دیا ہے ـــــ اسکول میں ساتھی لڑکے کبھی مجھ سے پوچھتے ـــــ "تم آگے چل کر کیا بننا چاہتے ہو ـــــ؟" تو میں بلا سوچے فوراً جواب دیتا۔ "میں سائنسداں بنوں گا ـــــ دُنیا کو خوبصورت بناؤں گا ـــــ دھرتی کو سورگ کا روپ دوں گا ـــــ"

پھر میں ذرا اور بڑا ہوا ـــــ جن آنکھوں سے میں نے خوبصورت بلب جگمگاتے دیکھے تھے، انھیں آنکھوں سے وہ تصویریں دیکھیں، جو اخباروں میں چھپی تھیں۔ یہاں وہاں بمباری ہی بمباری۔ جن کانوں سے میں نے ریڈیو پر مدھر نغمے سُنے تھے انہی سے تصوّر میں ماؤں اور بہنوں کی جگر خراش آہیں سنیں۔ کار کے پہیے جو منٹوں میں اِدھر سے اُدھر کرتے دیکھے تھے، لُٹی پٹی لاشوں کو قبرستان پہونچاتے دیکھے جن بجلی کے تاروں پر چائے بنتی دیکھی تھی، وہ موت کے لئے شاک پہونچانے کا کام انجام دینے لگے۔ میری آنکھیں سب کچھ دیکھتیں گردل خون کے آنسو روتا ـــــ کیا یہی وہ راہ ہے جس پر چلنے کے بارے

میں میں اس وقت سے سوچ رہا تھا جب میں نے اپنی ممّی کی انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا ؟ ؟

میں بہت چھوٹا لڑکا ہوں میرا ذہن بہت چھوٹا ہے ، میں زیادہ بڑی سوچ سکتا۔ لیکن یہ تو دیکھ سکتا ہوں کہ میرے گھر میں میری پیاری بہن ہیں جو روز میرے اور میرے بھائیوں اور بہنوں کے لئے میٹھی روٹیوں کا ناشتہ بناتی ہیں ـــــ میری پیاری بہن ہے جو ہنستی مسکراتی گھر کے گلدان میں پھول سجاتی ہے ۔ میری بھابی ہے جس کے ہاتھوں کی سُرخ مہندی کا رنگ ابھی پھیکا نہیں پڑا ـــــ میں چاہتا ہوں میری ممّی کسی دن ناشتہ تیار کر کے اُٹھیں تو اُن کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو نہ رہ جائیں۔ میری بہن گلدستہ سجانے اٹھے تو پھول مُرجھائے ہوئے نہ ملیں ـــــ میری بھابی کسی دن آنکھ کھولے تو اُن کی آنکھوں میں مہندی کا سُرخ رنگ تاریکی کا کاجل بن کر نہ رہ جائے ـــــ یہ بم ـــــ یہ مشین گن ـــــ یہ ٹامی گن ـــــ یہ اس دھرتی ماں کو دوزخ بنا دینے والی سب چیزیں اگر سائنس کی ایجاد ہیں تو میں سائنسداں ہونے پر لعنت بھیجتا ہوں ـــــ میں تو بس یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں سائنسداں ہوتا تو کبھی پھولوں کو مُرجھانے نہ دیتا۔ کبھی زمین کو اُجڑنے نہ دیتا ـــــ نہ کبھی کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھتا ـــــ اس چھوٹی سی دھرتی کو جنت بنا دیتا ـــــ امن کا ہرا بھرا باغ بنا دیتا۔

بارش

جاڑوں کے دن تھے ــــ چنّو میاں چھٹیوں کے ایک دو دن پورے پندرہ دن خالہ بیگم کے ہاں گزار کر آئے تو بس پوچھئے نہیں کیا حالت تھی۔ ہر بات میں خالہ بیگم کے گاؤں کا ذکر۔

"اجی جناب ــــ آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ گاؤں میں تو ہم نے وہ دیکھا جو آپ عمر بھر کبھی نہ دیکھ سکیں۔"

بات پیچھے ان کا یہی کہنا تھا بس ــــ قسم اللہ کی طبیعت بیزار ہوگئی اُن کی ڈینگوں سے۔ مگر ہم بھی کسی سے کیا کم تھے؟ ان کی ہر بات کو اس مزے سے کاٹ دیتے کہ بس وہ بیچارے مُنہ تکتے ہی رہ جاتے۔ ہم دل ہی دل میں خوب ہنستے کہ اچھا اُلّو بنایا۔

مگر ایک دن بڑی مصیبت ہوگئی ــــ چنّو بھائی ایک سال گاؤں میں کھائے ہوئے کھانوں کے ذکرِ خیر پر تُل گئے ــــ طرح طرح کے کھانوں کے نام لئے جا رہے تھے اور ہم بڑی بے چارگی سے بیٹھے سُنے جا رہے تھے۔ الحکم

بے بی نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"تو بوٹی کبھول نہیں ہی ...۔۔۔ تجھے تو ایک سے ایک بڑھیا کھانے پکانے آتے ہیں نا۔۔۔"

یہ بات تو سچ تھی کہ مجھے ایک سے ایک بڑھیا کھانے پکانے آتے تھے۔ مگر چنو بھائی اپنی ریل گاڑی (میرا مطلب ہے باتوں اور گپوں کی ریل گاڑی) روکتے تب کہتی نا ۔۔۔؟ مگر وہ تو فل اسپیڈ پر چلے جا رہے تھے۔

"اور جی سنا آپ نے خالہ بیگم سے ہاں ہم نے بوٹ پلاؤ بھی کھایا ۔۔۔ ایسا مزے کا کہ بس پوچھئے نا۔۔۔"

بے بی نے اور میں نے ذرا حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر بھی ذرا اجل کر بولی۔

"کیا کھایا تھا ۔۔۔؟"

"بوٹ پلاؤ ۔۔۔ بوٹ پلاؤ ۔۔۔ سمجھیں ۔۔؟ اور کبھی تم نے کھایا بھی ہے ۔۔۔ ارے صاحب بوٹ پلاؤ تو بس کچھ یاسمین کو ہی پکانا آتا ہے ۔۔۔ ہاں آپ کیا جھک ماریں گی بھلا۔"

میں سر سے پاؤں تک پوری کی پوری جل گئی ۔۔۔ اونہہ کر کے زبان چڑا کر بولی۔ "ہونہہ بڑے آئے یاسمین کے سگے ۔ ایک سالن تو ڈھنگ کا نہیں پکاتی۔ خواہ مخواہ تعریف کر رہے ہیں کہ ہم جلیں۔ مگر یاد رکھیے ہم نہیں جلنے والے۔ ہم کون اس سے کم ہیں!"

چنّو بھائی سنجیدہ ہو کر بولے "اللہ قسم بھئی ایسے بڑھیا کھانے پکانے لگی ہے کہ تم کھاؤ تو بس انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ ـــــ اور قسم ہے وہ بوٹ پلاؤ تو ایسا لذیذ تھا کہ آج بھی یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اڑ کر گاؤں پہنچ جاؤں"۔ میں چڑ کر بولی۔ "موئے نا اصل پلاؤ کے لئے مکھیوں کی طرح اڑنا چاہ رہے ہو ـــــ چھی ـــــ!"

اس بات پر چنّو بھائی بُری طرح جل گئے ـــــ بولے۔

"ایسی ہی بڑی پکانے والی بی بی ہے تو پھر مجھے کھلاتی کیوں نہیں؟"

اب تو مجھے بھی تاؤ آ گیا بھبک کر بولی۔ "اور کیا سمجھتے ہیں آپ ـــــ لیجئے آج شام کو ہی کھائیے۔"

"ہاں" وہ خوش ہو کر بولے "آج کل بوٹ کا سیزن بھی تو ہے۔"

میں نے ان کی طرف کچھ حیرت سے دیکھا۔ ہونہہ بوٹ کا سیزن! بوٹ کا سیزن کیا بات ہوئی بھلا؟ سارا سال ہی بوٹ پہنے جاتے ہیں۔ کچھ ایسا تو ہے نہیں کہ لوگ جاڑوں میں بوٹ پہنتے ہوں اور گرمیوں میں اٹھا کر رکھ دیتے ہوں پاگل ہیں چنّو بھائی بھی۔ اور جناب میں نے تو بالکل طے کر لیا کہ بس اب شام کی تیاری ابھی سے شروع!! چنّو بھائی جاتے جاتے بول گئے۔

"مگر دیکھو بھئی ہرا بوٹ ہونا چاہیئے ـــــ پیلے اور سوکھے مارے بوٹ کا پلاؤ اچھا نہیں بن سکتا۔"

لے لو۔ یہ نئی مصیبت سر تھوپ گئے۔ اب ہم ہرا بوٹ کس کا ڈھونڈتے پھریں ـــــ؟ پہلی بات تو بوٹ چرا کر پلاؤ پکانا ہی خطرے سے خالی نہ تھا اوپر سے بوٹ بھی ہرا ـــــ! ہونہہ ـــــ خیر صاحب۔ وہاں سے اُٹھے تو ایک ایک کے کمروں میں گھومتے پھرے۔ بھائی کے بوٹ تو بہت بڑے بڑے تھے۔ اتنے بڑے بوٹ کا پلاؤ تو ساری برات کو کافی ہو جاتا ہمیں تو ذرا سا پکانا تھا بس۔ ابا جان کے بوٹ تو اس سے بھی کچھ سوا تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ دو تو بج ہی چکے تھے اور پھر چنو بھائی ندیدے تو شام کے سات بجے ہی کھانے پر پل پڑتے تھے۔ ـــــ بھئی پانچ گھنٹے میں آخر کیا ہو سکتا تھا ـــــ؟ جلدی جلدی تلاش شروع کر دی اور جناب منزل تک پہونچ ہی گئے۔

بقر عید میں بہت کم دن رہ گئے تھے نا ـــــ اس لئے ابا جان سبھوں کے لیے جوتے لے آئے تھے۔ بلو کے کمرے میں ایک بہت خوبصورت مخملیں ہرا بوٹ رکھا ہوا تھا۔ نرم نرم اور بہت اچھا یقیناً اس کا پلاؤ بے حد لذیذ بنے گا ـــــ اور جناب ہم سب کچھ طے کر کے وہ بوٹ اپنے کمرے میں اٹھا لائے۔

پہلے تو اتنا پیارا بوٹ کاٹتے ہوئے بہت دل دُکھا، مگر پھر سوال یاسمین کا تھا۔ ورنہ چنو بھائی تو صاف کہہ جاتے کہ "ہونہہ پکانا ہی نہ آتا ہوگا، چپ بہانے تھے کہ بوٹ کاٹنے کو جی نہ چاہا"

لیجئے بسم اللہ کہہ کر کاٹ بھی دیا۔ بھائی صاحب سے نیوتہ گیا۔ بکس سے
نیچے رینر زیور پہلے ہی حاصل کر لیا تھا۔ جلدی جلدی دونوں بوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے
کر ڈالے —— !

نصیبن بوا کو آئے۔ تو مرچ مصالحہ رکھنے کو کہہ دیا تھا۔ دوپہر کا
سارا سامان رکھ کر اپنے گھر جا چکی تھیں —— باورچی خانے میں ہر کام کا
تھا۔ بس اپنا ہی راج تھا۔ میں، بے بی، افروز، شہنو —— کے سب باورچی
خانے پر پل پڑے —— تھوڑی ہی دیر میں بڑی گہما گہمی نظر آنے لگی۔
افروز چاول دھونے بیٹھ گئی —— شہنو گھی، تیل، مصالحے لا لا کر
مجھے دینے لگی —— پلاؤ بڑے زور شور سے پکنے لگا۔

بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ گھر پر بھی، اور اسکول میں بھی
بارہا ہم نے پکوان پکائے تھے، مگر جہاں تک بوٹ کا پلاؤ پکانے کی
بات تھی، وہ ہم آج پہلی دفعہ ہی پکا رہے تھے۔ اس لئے ذرا گھبراہٹ
بھی ہماری تھی اور ستم یہ کہ ابھی ابھی نامراد چنو بھائی کہہ گئے تھے کہ چونکہ
بوٹ پلاؤ بار بار نہیں پکتا، اور کھانے کے لائق چیز بھی ہے، اس لئے
انھوں نے اپنے دو چار دوستوں کو بھی بلوا لیا ہے ۔۔ !!

"ہائے ہائے مر گئے" میں جگر تھام کر چلائی۔

"ہوا کیا؟" سب دوڑی دوڑی آئیں۔

"بھئی اللہ ہم نے تو بس ایک سیر چاول لئے تھے۔ انہوں نے تو اپنے

چنُو رے دوستوں کو بھی دعوت دے ڈالی ہے۔ وہ تو سارا کا سارا بلا وِیار کر جائیں گے۔ اور پھر بوٹ تو ایک ہی سا تا تھا ہم۔!!"

بڑی دیر بعد فیصلہ ہوا کہ ہر ا بوٹ نہیں تو کسی بھی پیلا یا سوکھا مارا ہی کسی کا اُٹھا لائیں۔ پھر سے جناب ہم سب لڑکیاں کمروں کی طرف دوڑ پڑیں۔ ایک سے ایک مٹریل بوٹ دیکھنے میں آرہا تھا ——— کسی کے تا گھسے ہوئے۔ کسی کا اوپر کا حصّہ غائب ——— کسی کی ایڑی ہی سرے سے نداردتھی۔ تو کوئی عین بیچ میں منہ پھاڑ کر جمائی لیتا نظر آرہا تھا ——— بڑی دیر کی تلاش کے بعد چنو بھائی کا ہی ایک بوٹ چُنا گیا۔ اچھا نیا نیا بوٹ تھا بدنصیب ——— اور غالباً وہ بھی عید کی تیاری میں خریدا گیا تھا۔

بڑی مشکل سے اس کے ٹکڑے کئے گئے اور پوری پلٹن پھر سے باورچی خانے میں داخل ہوگئی۔ میں چونکہ سب میں بڑی تھی۔ (بڑی بھی تو یہی ساڑھے سات آٹھ سال کی!) اس لئے سارے کام میری نگرانی اور میری ذمہ داری پر ہو رہے تھے ——— اور اپنے اس اعزاز پانے پر میں بے حد خوش تھی اور خواہ مخواہ ہر ایک کو ڈانٹ ڈپٹ کررہی تھی۔

بہرحال جناب میں نے بوٹ کے ٹکڑے ایک برتن میں صاف پانی لے کر خوب دھوئے اور پہلے انھیں الگ سے تل لیا۔ اب بار بار دیکھی ہوں کم بخت ذرا بھی نہیں گلتے ——— خیر ہم نے سمجھا کہ چاولوں کو جب دم پہ رکھیں گے تب بھاپ میں یہ بھی گل جائیں گے ——— ایک بار ... دوسری

پلاؤ پکانے میں گا جریں ذرا کچی رہ گئی تھیں، تو پھر چاولوں کے ساتھ بھاپ میں گل گئی تھیں ——!

بوٹ پلاؤ کے ساتھ کھانے کو میں نے دہی کا اہتمام بھی کر لیا کیونکہ آپ جانیں پلاؤ تو بغیر دہی کے بالکل ہی بے مزہ اور بے کار چیز بن جاتا ہے۔ اب جناب ایک بڑے سے بگونے میں گھی، لونگ، سیاہ مرچ اور الائچی ڈال کر چاول بگھار دیئے —— ساتھ ہی جھونک دیا۔ اور جب چاول گلنے پر آ گئے اور دم پر رکھنے کی نوبت آ گئی تو بوٹ کے تلے ہوئے ٹکڑے بھی اس میں ڈال دیئے۔!

"واہ وا باجی"۔ زینو دور سے ہی خوشبو سُن کر دوڑی آئی۔ "کیا خوشبو دار پلاؤ پکایا ہے کہ قسم اللہ میری تو طبیعت ابھی سے کھانے کو چاہنے لگی"۔

چنو بھائی ادھر سے گذرے تو انھوں نے بھی یہی بات دہرائی۔ اب جناب ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا —— چونکہ سارے کام ہماری "لیڈر شپ" میں ہو رہے تھے اس لئے دستر خوان بچھوانے کا اہتمام بھی ہم ہی نے کروایا۔ ہمارے سگھڑاپے پر چونکہ میٹھا نہ ہونے سے حرف آتا تھا، اس لئے ہم نے جھٹ پٹ نعمت خانے کا رُخ کیا اور پنکی کے پینے کے لئے جو دن بھر کا دودھ رکھا تھا اس کو اٹھا کر کھیر بنا دی۔!

اصولاً کھانا سات بجے تیار ملنا چاہیئے تھا، مگر پھر بھی ہم ذرا ناسمجھ لوگ تھے اور کام بہت بڑا تھا۔ اس لئے اچھے خاصے ساڑھے آٹھ بج گئے

اور ایک سرے سے سارے گھروالے ہی بھوک بھوک چلّانے لگے چلئے بھئی
ہم نے کسی نہ کسی طرح جلدی جلدی دستر خوان لگایا ـــــ بڑے سلیقے سے
کھانا چُنا اور سب مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں چلنے کی "دعوت" دی۔
اس وقت خواہ مخواہ اپنی بڑائی کا احساس ہو رہا تھا کہ اتنے سارے
لوگوں کا کھانا مجھ اکیلی نے پکایا ہے۔ اور میں اس امید میں سب کے سامنے
کھڑی تھی کہ جیسے ہی نوالے منہ میں پڑیں اک دم تعریف کا شور مچ جائے۔ جنّو
بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرما رہے تھے۔
"بھئی آج ہماری بہن نے خاص طور سے ہمارے لئے بوٹ پلاؤ پکایا ہے"
"تب تو ٹھاٹھ ہیں اپنے" ان کے ندیدے دوست کورس میں بولے۔
اور سب ہاتھ دھو کر دستر خوان کے گرد بیٹھ گئے۔ مگر ابھی جنّو بھائی نے پلیٹ
میں پلاؤ لے کر پہلا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ وہ جھک کر غور سے پلیٹ کو
دیکھنے لگے۔

"یہ کیا پکا دیا ہے ـــــ" وہ ذرا اُلجھ کر بولے۔ میں خوشی خوشی ذرا آگے
بڑھ کر بولی۔ "بوٹ پلاؤ ـــــ کیوں اچھا ہے نا"
وہ ذرا شرمندگی سے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔
"تھو تھو ـــــ ایسا لگ رہا ہے جیسے مرا ہوا چوہا کھا رہا ہوں"
مجھے تن تنا کر غصہ آگیا۔ "کتنی بار آپ نے مرے ہوئے چوہے کھائے
تھے جو ان کا مزہ بھی معلوم ہے؟۔ اتنی محنت سے تو سارا دن لگا کر بوٹ پکایا،"

اور ذرا دل نہیں رکھنا چاہتے۔"

اب تک سب اپنی اپنی پلیٹوں میں پلاؤ لے چکے تھے۔ اور ہر شخص "ریسرچ" کیا نظر آ رہا تھا۔ یعنی ہر ایک کو اپنی اپنی پلیٹ پر گہری نظریں

"یہ ہرا ہرا کیا چمک رہا ہے بھئی اس میں" کوئی بدتمیز دوست بولا۔

میرا پارہ چڑھ گیا۔" چنّو بھائی نے تو کہا تھا کہ بوٹ ہرا ہونا چاہیئے۔ اسی لیے تو میں نے خاص طور سے مٹر کا ہرا بوٹ کاٹ کر پلاؤ پکایا ہے۔"

"مٹر کا بوٹ ——!" چنّو بھائی زور سے چلائے۔

"اس میں اتنا چلانے کی کیا بات ہے —— ؟ ہاں کمی آنے لگی تو آپ کا بوٹ بھی ڈال دیا —— آپ کے دوست آ رہے تھے نا ——؟؟"

"میرا بوٹ —— ارے باپ رے مر گیا۔ پورے سولہ روپے آٹھ آنے کا اپنی جیب خرچ میں سے خریدا تھا رے اللہ میاں ——" ایسا کہہ کر چنّو بھائی دیوانہ وار اپنے کمرے کو بھاگے، اور تھوڑی ہی دیر میں واپس آ گئے۔ ان کا منہ تو لٹکا ہوا تھا مگر میرا چہرہ دیکھ کر مجھ سے انھوں نے جیسے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

"سنئے حضرات —— میری بے وقوف بہن کا۔ اپنے بھائی کو اپنے ہاتھوں پکایا پکوان کھلانے کو جی چاہا تو جوتوں کا پلاؤ پکا کر رکھ دیا۔"

"کیا مطلب ——؟ کیا مطلب ——؟ کیا مطلب ——؟"

بس ہر طرف سے یہی ایک آواز آ رہی تھی —— اور چنّو بھائی ہنسی کے مارے

روٹتے لوٹتے سُنائے جا رہے تھے کہ کس طرح یاسمین نے بونٹ پلاؤ نے اور شمر کو بھی بونٹ پلاؤ پکانے کی ترغیب دی۔ اور ......

تھوڑی ہی دیر میں یہ عالم تھا کہ میں جس کی طرف بھی دیکھتی تھی وہ ہنسی سے ایک فٹ پھٹا ہوا نظر آتا تھا ــــ ہی ہی، ہا ہا، ہو ہو، ٹھی ٹھی، کھی کھی، کھو کھو ـــ ایسے عجیب و غریب قہقہے میں نے اپنی عمر بھر نہ سنے تھے۔ طرح طرح کے سُر اور راگ سب کے گلوں سے نکل رہے تھے اور میں قہقہوں کی اس بارش میں بھیگ کر جیسے چڑیا بنی جا رہی تھی۔

بھئی اب ـــــ اتنے دن گذر جانے پر میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس میں ہمارا کیا قصور کہ اچھے بھلے ہرے چنے کو بونٹ کہا جائے ـــــ؟ اور سچ بھی تو ہے کہ بونٹ کے معنی سوائے جوتے کے اور کیا سمجھے جا سکتے تھے۔

قصور تو بھابی کا تھا، کیا ہوتا اگر ہری کھچڑی یا چھولے کہہ دیتے۔؟؟ مگر نہیں صاحب انھیں تو ہمیں رسوا کرنا تھا۔

بہت دن بیت گئے ہیں مگر آج بھی ان قہقہوں کی زور دار بارش کا خیال آتا ہے تو جسم میں کپکپی پیدا ہونے لگتی ہے۔!

مسٹر توڑ پھوڑ

گڈّو میاں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ــــــ
الماری کے اوپر والے خانے میں مٹھائی کا ڈبّہ رکھا ہوا تھا۔ ہاتھ وہاں تک پہنچنا مشکل تھا اور مٹھائی کھانی ضرور تھی ــــ ! کریں کیا ــــ ؟ اور سامنے ہی تو ابّا میاں کی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ کرسی سامنے کھسکائی اور چڑھ گئے ــــ ہاتھ بڑھایا مگر افسوس کہ ہاتھ پھر بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا۔

"اب کیا ہوگا ــــ ؟" باہر نگاہ دوڑائی، امّی کی تپائی، جس پر وہ اپنے سینے پرونے کا سامان رکھا کرتی تھیں۔ پڑی ہوئی تھی۔ چپکے سے دوڑ کے اور اٹھا لائے ــــ اب سب سے پہلے کرسی، کرسی پر تپائی اور تپائی پر خود دو بالشت کے گڈّو میاں ــــ اب ہاتھ مٹھائی تک پہنچ تو گیا لیکن قسمت میں شاید مٹھائی کھانا نہ لکھا تھا ــــ ہوا یہ کہ ادھر سے عین "موقعہ واردات" پر بلّی میاؤں میاؤں کرتا آگیا ــــ
گڈّو میاں کا ہاتھ کانپ گیا ــــ اور ساتھ ہی جسم بھی ــــ !

ہاتھ کانپا تو ڈبہ چھوٹ گیا اور جسم کانپا تو تپائی اور کرسی ہل گئیں ۔۔۔ اور تھوڑی دیر میں کرسی مع ڈبے، تپائی اور گڈّو میاں کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔
گڈّو میاں کو بڑا سخت قسم کا غصّہ آیا کہ کم بخت پیلو کی وجہ سے مٹھائی ضائع ہوگئی۔ پاس پڑا رول اٹھایا اور اس زنّاٹے سے اس کی کمر پر رسید کیا کہ وہ بیچارہ وہیں لڑھک گیا ۔۔۔ لڑھکتے لڑھکتے اس نے "غاؤں" کرکے ایسا ڈرا دیا کہ گڈّو میاں خود پیچھے لڑھک گئے۔ لڑھکتے میں سہارا لیا ابّا میاں کی میز کا ۔۔۔ گڈّو میاں تو لڑھکے ہی لڑھکے ۔۔۔ ابّا میاں کی میز بھی لڑھکی ۔۔۔ ابّا میاں کا سارا سامان زمین پر بکھر گیا ۔۔۔ پیپر ویٹ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ عینک دو حصّوں میں بٹ گئی ۔۔۔ شیشے کا گلدان ریزہ ریزہ ہوگیا ۔۔۔ اور خود گڈّو میاں کا ذرا سا ہاتھ بھی چھِل گیا ۔۔۔ بڑی جان جلی کہ کہاں تو مٹھائی کھانے آئے تھے۔ مٹھائی گئی تو گئی اوپر سے ہاتھ بھی رگڑا کھا گیا ۔۔۔
"اب کیا کریں ۔۔۔؟" "چلو بھئی یہ نہیں تو بیڈمنٹن ہی کھیل لیں۔ اتنے سارے بلّے ہیں اور اتنی ساری "چڑیاں" جب دیکھو تب باجی - ابّا میاں، بھیّا اور ماموں جان کھیل رہے ہیں ۔۔۔ کبھی ہمیں تو موقع ملے ۔۔۔!" کہنی سہلاتے اٹھے اور الماری کی طرف بڑھے ۔۔۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھ لیا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ۔۔۔ پھر زمین پر گری ہوئی مٹھائی مٹی صاف کرکے تھوڑی سی کھائی ۔۔۔ جی للچایا تو اور بھی

اٹھائی مگر دوسرے ہی لمحے منہ میں پچ پچ ہونے لگی تو پھر آگے بڑھ گئے۔

اُف الماری میں تو تالا لگا ہوا تھا ـــــ ابا میاں کے کمرے میں تلاشی لی جانے لگی۔ ضرور چابیاں کوٹ میں ہوں گی۔ کوٹ کی اوپری جیب تک ہاتھ نہ جاتا تھا۔ اس لئے کھڑے کھڑے کوٹ کو خود تک پہنچانے کا یہ انتظام کیا کہ کوٹ کو پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا ـــــ کوٹ یقیناً آ گیا مگر کس حالت میں کہ اوپری حصّہ تو کیل میں ٹنگا رہ گیا، اور مطلوبہ جیب مع نچلے حصّے کے ان کے اپنے ہاتھوں میں۔ چابی نکالی ـــــ قفل کھولا۔ بتّے اور چڑیاں سلیقے سے دھری ہوئی تھیں ـــــ نچلے خانے سے۔ وبتّے اور ایک چڑیا نکالتے ہی تھے کہ ایک دم سے شامت کا مارا کوئی چوہا پھدک گیا ـــــ چوہا پھدکا اور ساتھ ہی گڈو میاں بھی پھدک سکے ـــــ گڈو میاں پھدکے تو اُن کے ہاتھ بھی چھپ کے ـــــ ہاتھ میں کتنے بتّے اور چڑیا ـــــ وہ اُچھل کر ان کے قدموں میں آگرے ـــــ چوہا پھر ان کے پیروں میں آ گیا ـــــ اور جناب یہ اُچھل پھاند مچانے لگے ـــــ تھوڑی ہی دیر میں چڑیا تو دب دبا کر ٹوٹ چلی تھی اور بتّے کی جالی ٹکڑے ٹکڑے ـــــ مٹھائی بھی نہ ملی ـــــ اوپر سے چوٹ بھی لگی اور کھیل بھی گیا۔

"اب کیا کریں ـــــ ؟"

امّی کی الماری بھی پاس ہی کھڑی رہتی تھی ـــــ امّی کی الماری میں تو یقیناً پیسے رہتے ہوں گے ـــــ اب زیادہ سے زیادہ یہی سوچا جا سکتا

تھا کہ کسی طرح پیسے حاصل کر کے دوستوں کے ساتھ چھوٹی موٹی پکنک منائی جائے دوسرے کمرے میں جھانکا ـــــ گرمیوں کی سنسناتی دوپہریں تھیں، بھلا کون اس وقت جاگتا تھا ـــــ؟ امی بے چاری پڑی خرخر سو رہی تھیں ـــــ پلو میں چابیاں بندھی تھیں۔ کھولتے تو جاگ جانے کا ڈر ـــــ قینچی لائے اور امی کی نئی ساڑی مع چابیوں کے کتر ڈالی۔ دبے پاؤں الماری تک آئے کھول کر دیکھا! "اخاہ کتنے سارے پیسے ہیں ـــــ؟" اور امی بھی شاید اپنی ہی طرح کھلونوں کی شوقین ہیں۔ یہ کافور کا گلابی گلابی ہوا ـــــ یہ پلاسٹک کی موٹر اور یہ کانچ کی مرغی ـــــ یہ سب ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھا کیونکہ امی کی الماری بھی شاید ابا میاں کی کم بخت الماری کی سگی بہن تھی کہ قد و قامت میں بالکل ساری تھی ـــــ ابا میاں کی کرسی کی ٹانگ چونکہ ٹوٹ چکی تھی اس لئے اب گھسیٹتے ہوئے میز کو قریب لائے تاکہ اس پر کھڑے ہو کر پیسے نکال سکیں ـــــ میز کا قد بھی چھوٹا نکلا۔ گڈو میاں کے اپنے قد کی طرح ـــــ اچکتے جاتے اور پیسے اٹھاتے جاتے ـــــ الماری کا پٹ ایک ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ پیسے بٹورنے میں مشغول تھا۔ ایک بار جو زور سے اچکے تو الماری اپنے پٹ کے وزن پر خود سامنے آنے لگی ـــــ اب تو بس، گڈو میاں کو اتنا کچھ نظر آ رہا تھا کہ الماری تشریف لا رہی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ حال تھا کہ وہ کافور کا ہوا ـــــ پلاسٹک کی وہ موٹر اور کانچ کی مرغی، کھن کھناتے پیسے، امی کے ریشمی کپڑے اور بڑی سی الماری ـــــ سب کچھ ایک زوردار آواز کے

ساتھ زمین پر آرہا ـــــ اور خود گڈو میاں آرام فرمارہے تھے، بمشکل خود کو کھینچ کھانچ کر دور اٹھا کر کھڑا کیا اور صورتِ حال کا جائزہ لینے لگے ـــــ خدا کا شکر تھا کہ الماری کے نیچے نہیں دبے ورنہ ختم ہی تھے ۔ زوردار آواز سن کر ہر کونے سے گھر کے بڑے لوگ آنے لگے ۔ ادھر سے امّی تو ادھر سے باجی ـــــ بیٹھک سے ابّا میاں، تو ڈرائینگ روم سے بھائی جان ۔

باجی آگے بڑھیں تو دیکھا ایک طرف مٹھائی بکھری پڑی ہے ۔ دوسری طرف تپائی مع ٹوٹی ٹانگ کی کرسی کے ـــــ ادھر میز مع سارے سامان کے زمین پر آرام فرما تھا، تو ادھر ٹوٹے بلّے اور چڑیا بے سدھ پڑی ہوئی تھی ـــــ سامنے ہی ابّا میاں کا نیا کوٹ چیتھڑے ہو کر لٹک رہا تھا ۔ اور عینک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فریاد کر رہی تھی ۔ بے چاری امّی کی الماری تھی کہ زمین پر بچھی ہوئی تھی ۔ اور ادھر کانچ کی مرغی، کافور کا ہوا اور پلاسٹک کی موٹر تھی کہ بغیر ڈرائیور کے چل پڑی تھی ـــــ ہر طرف پیسے ہی پیسے بکھرے ہوئے تھے جیسے بارش کے ساتھ آسمان سے ٹپکے ہوں ۔ اور پیلو مہاراج آنکھیں بند کئے پڑے تھے ۔

ابّا میاں نے حیران ہو کر دیکھا ـــــ عینک نہ ہونے سے ایک تو یونہی انھیں کم دکھائی دے رہا تھا ـــــ بولے ـــــ "ہیں ۔ ؟ یہ کس کا کمرہ ہے ـــــ ؟"

باجی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ـــــ پورے کمرے کا

سامان تتر بتر پڑا تھا ——— ٹوٹ پھوٹ کر پڑا تھا اور خود گڈو میاں؟ ——— ہونٹوں کے آس پاس مٹھائی لگی ہوئی ——— بالوں میں دھول ——— کہنیوں میں زخم ——— گھٹنوں پہ خراشیں اور جیبوں میں کھن کھن پیسے ——— باجی نے بڑھ کر گڈو میاں کے کان پوری طاقت سے کھینچے اور ایک تھپڑ لگا کر بولیں ———

"کم بخت کہیں کا ——— یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے ——— ؟ تھپڑ بڑے زور کا پڑا تھا مگر گڈو میاں نہ تو چیخے نہ چلائے ——— نہ روئے نہ دھوئے! حتیٰ کہ آنکھ میں ایک آنسو تک نہ آیا۔ البتہ اتنی بات ضرور کہی ———

"قسم اللہ کی یہ گھر کے بڑے لوگ! کیا مجال ہے جو ہم ذرا ادھر کا تنکا اُدھر کردیں ——— !"

بُلبُلِ ہزار داستان

ایک تو گڈّی بی بی خوبصورت ـــــ دوسرے ان کی ادائیں ـــــ ہائے غضب ـــــ بس پارہ تھیں پارہ ـــــ سارے گھر کا ان کے مارے ناک میں دم تھا ـــــ شرارتیں کرنے کا تو گویا ٹھیکہ لے رکھا تھا ـــــ میز پر سیاہی پھیلی ہوئی ہے تو سمجھ لیجئے بلاشبہہ گڈّی نے گرائی ہے ـــــ گلدان کے پھول بچے ہوئے ہیں تو ذہن میں سوائے گڈّی کے اور کس کا نام آسکتا ہے ـــــ؟ بھائی جان کی ٹافیاں تو سزے سے دو دو آنے میں ملنے والی ٹین کی گاڑیوں میں ہوتی جاتیں۔ ان کے بڑے بڑے جوتے گڑیوں کا گھر بنتے۔ پہلے پہل تو سارے بچّوں نے حد درجہ اعتراض کرنا شروع کیا۔

"کوئی حد ہے ـــــ ہم تو کبھی اپنی گڑیا کو جوتے میں نہ بٹھائیں"۔

"ارے واہ کسی نے دُلہن کو جوتے میں تھلایا ہوگا"۔

گڈّی بیگم تو جدید ترین فیشنوں کی موجد ہیں ہی ـــــ انھیں اپنے اعتراض

بھلا کیا کھلتے ؟!

"ارے بھئی قسم ہے، خود ہم نے اپنی آنکھ سے آج کل اس ٹائپ کی کاریں دیکھی ہیں۔"

کسی نے اور کچھ اعتراض کیا تو بول پڑیں۔ "بھئی اللہ ہم خود ڈیڈی کے ساتھ رشیدا نکل کی کار میں پک نک پر گئے تھے۔ بس ہو بہو جوتا ہی دکھتی تو۔"

پھر تو یہ ہونے لگا کہ ریک سے سارے جوتے آنگن کے پچھواڑے ملتے اور جو بابی جان جتاتے ہوئے آنگن سے جوتے سمیٹ کر لاتے تو کسی میں دلہن بیٹھی ہے تو کسی میں دولہا۔ اور تو اور "گھر" سجانے کی خاطر جو رنگ چڑھائے جاتے تھے وہ جوتوں کا روپ ہی دونا کر دیتے! نتیجے میں آئے دن ہنگامہ، اور ان کے ساتھ سب ہی کی پٹائی ہوتی —— مگر توبہ کیجیے جو وہ ذرا بھی تو پیسہ بس بڑے ذہن: غضب خدا کا —— زبان تو وہ تیز پائی تھی کہ بڑے بڑوں کے منہ بند کر دیں —— اس پر بھی امّی کا دن لاڈ کرو بیٹے نہیں ابا الٹا جوتے دلائیں مگر پھر خود ہی لاڈ کرنے بیٹھ جائیں۔

"ارے یہ تو میری نابلی ہزار داستاں ہے —— یہ نہ پوچھئے تو گھر میں چل پل کیسے مچی۔"

گھر میں کسی ایک بچے کو چاہا جائے تو دوسرے بچے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، گڈی، ڈولی کے بھی ان گنت دشمن تھے۔ گڑیا کیسے خاطر میں لاتیں کیونکہ چھوٹے موٹر گاڑی پیاری حیا دی تو کبھی منّی کے جوتے لے جا کر پھولوں کے

کیلیں چھپا دیئے اور جناب وہ تو ابّا ہم کو نہ چھوڑتیں ۔۔۔۔ اُس دن ابّا
نے عید کی خوشی میں معاف کر دیا شاید۔ ورنہ وہ پٹائی ہوتی کہ اچھلنا
بھول جاتیں۔ ہوا یوں کہ ابّا اپنی کتابیں رکھنے کے لئے ایک نیا شیلف لائے
اس سے پہلے والا بک شیلف وہیں ابّا کے کمرے میں ہوتا تھا مگر شاید
بلبل ہزار داستان کی نظر نہ پڑی ہوگی ۔۔۔۔ تب ہی وہ نئے شیلف کو دیکھ کر
اچھل پھاند مچانے لگیں۔ "آہا جی ۔۔۔۔ اوہو جی ۔۔۔۔ ڈیڈی گڑیا گھر لائے
ہیں، آہا ہو ہو۔" اب دوسرے بڑے بچے تک ہار کر سمجھا رہے ہیں، مر مر کر
کہہ رہے ہیں کہ بی بی یہ تو تمھاری گڑیا کا محل نہیں۔ ۔ کتابیں رکھنے کا شیلف
ہے۔ مگر کس کی مانتیں ۔۔۔۔ ؟؟ کہنے لگیں "یہ جو خانے بنے ہوئے ہیں
تو اسی لئے کہ سب الگ الگ رہیں اور لڑیں جھگڑیں نہیں ۔۔۔۔ اور جو یہ گول
گول گھومتا کھمبا ہے تو اس لئے کہ گڑیوں کے بچے اگر رونے لگیں تو اس "چھت"
پر چڑھا کر انھیں جلد پھیریاں دی جائیں۔"

ان کی زبان کی تیزی کے آگے کون منہ کھول سکتا تھا۔ بس جناب
ہتھوڑی اور کیلیں لے کر پہنچ ہی تو گئیں۔ ہر طرف کیلیں ٹھونک کر اس
میں رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے اور پیپر فلاورز لگا دیئے۔ ایسا شاندار
گڑیا گھر تیار ہوا کہ سب بچے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ۔۔۔۔ ابّا کے پاس
تو کوئی نہ کوئی دوڑ ہی جاتا، اتنا ڈر بھی کیوں رہے؟ سب کو اپنے ساتھ
ملا لیا ۔۔۔۔ سبھوں کی گڑیوں کو ایک ایک کمرہ دے دیا، ہر چند کہ ڈیڈی

اپنے ہی لئے گڑیا گھر لائے تھے۔ پھر بھی اگر وہ محض اسی بات پر چڑ جاتے کہ اگلے دن تو عید ہے اور یہ بجائے عید کی تیاریوں کے الٹے پلٹے دھندوں میں ہی جتتے ہوئے ہیں تو ـــــ ؟!

شام کو ننھے منے دوست اپنی اپنی عید کی پوشاکیں اور تیاریوں کی داستانیں، بتانے سنانے آئے تو گڈی نے سب کو اپنا گڑیا گھر دکھایا ـــــ جہاں اب کترنوں کے بچے کھچے کپڑوں کے پردے بھی لٹکا رہے تھے۔ دل میں تو سب جل گئے مگر منہ سے تو کہنا ہی پڑا۔

" واہ بھئی ـــــ بڑا اچھا گھر ہے۔ اچھا کل آئیں گے ـــــ ٹاٹا۔" عید کا کیا ہے۔ ایک دن کے لئے آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔ گڑیا گھر کی خوشی تو لافانی بن کر آئی تھی۔ گڈی کی اتراہٹ کا کیا پوچھنا تھا؟؟

ابا عیدگاہ سے لوٹے تو مزے سے آکر گردن میں جھول گئیں۔

" ہماری بٹیا کتنی عیدی لے گی؟"

جواب میں بٹیا اور بھی اترا گئیں "آپنے تو پیشگی عیدی دے ڈالی ڈیڈی ـــــ غضب خدا کا کتنا اچھا گھر ہے ڈیڈی۔"

" ہائیں ـــــ کیا بک رہی ہے۔" ابا جھنجلائے۔

" ہاں ہاں اور جو کل آپ لائے ہیں تو پھر کیا ہے؟"

ابا نے تو شیلف گیسٹ روم میں رکھوا دیا تھا کہ عید کے بعد فرصت سے اسے اپنے کمرے میں جائز مقام پر رکھوائیں گے آنکھیں گھما کر دیکھا اور پوچھا۔

"گھر، کیسا گھر بھئی" جواب میں بٹیا رانی ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی گیسٹ روم تک ڈیڈی کو لائیں۔ ارے یہ کیا ــــ؟ نیا شیلف! پورے تین سو روپے میں بنوایا تھا۔ کیلے چھپے ہوئے، ہتھوڑی کی مار سے پالش جگہ جگہ سے اُکھڑی ہوئی ــــ گوند سے چپکائی گئی جھنڈیاں ــــ جھرلتے غبارے، رنگین پھول ــــ اُف ــــ اُف۔ "یہ سب کیا ہے بے بی؟" ڈیڈی بھپر کر بولے۔

"جی گڑیا گھر!"

اب تو ڈیڈی کا پارہ آخری سرے تک چڑھ گیا۔ ابھی کچھ پٹائی کرتے ہی تھے کہ امّی بائیں بائیں کرتی لپکی آئیں۔

"اے لو ــــ بھلا عید کے دن بچی پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟"

ابّا نے گڑبڑا کر امّی کو دیکھا پھر اپنی لاڈو کو۔ مُنہ سے تو کچھ بولے نہیں مگر پیر پٹختے کمرے کو چلے گئے۔

دوسرے دن ابّا نے اپنے کمرے میں شیلف منگوایا ــــ سب کیلیں، جھنڈیاں، جھاڑ جھنکار، غبارے اور پھول نکال باہر کیے ــــ اب جو شیلف اپنی اصلی صورت میں سب کے سامنے آیا تو سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ لگتا تھا، ہتراج گھر سے دو چار روپے میں اٹھا کے لائے ہوں گے۔

بی گڈی کا یہ عالم کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ــــ ساری چہک چہکار ہوا ہو گئی۔ اب کے تو ابّا کو بھی اپنی "بلبلِ ہزار داستان" پر پیار نہ آیا۔ بار بار

غصّے سے گھورا کئے اور پھر نتیجے میں رانی بٹیا سے بول چال بند کردی۔

اور جناب آپ کو معلوم ہے کہ لاڈلے بچوں سے ماں باپ بات بند کر دیتے ہیں تو کیا ہوتا ہے ــــ؟ انھیں بہت دکھ ہوتا ہے جسے وہ مشکل برداشت کر پاتے ہیں اور پھر بیمار پڑنا تو لازمی ہے ــــ گڈّی بی بی نے بھی کھٹیا کھائی ــــ کچھ تو موسم ہی بدل رہا تھا اور کچھ ان کا دل ہی اداس تھا ــــ! پلنگ پر پڑے پڑے انھیں بس یہی خیال آتا کہ ہائے سب کے سامنے کیسی رسوائی ہوئی ــــ بلا سے ڈیڈی دو چار طمانچے ہی جڑ دیتے۔ مگر اف انھوں نے تو بات ہی بند کردی ــــ اچھی بُری کوئی بات سنتے نہ جواب دیتے۔ اسکول کی رپورٹ آتی تو کچھ توجّہ بھی نہ دیتے۔ گڈّی نے اپنے کمرے میں ایک دن یہ بھی سُنا ــــ ابّا، امّی کی بات کے جواب میں کہہ رہے تھے۔

"ہمیں ایسی اولاد کی ضرورت نہیں جو ہمیں اس قدر پریشان کرے۔"

اس نے صاف دیکھا کہ ڈیڈی یہ جانتے تھے کہ وہ یہ باتیں سُن رہی ہے تب بھی اس کے دل کا کوئی خیال نہ کیا۔ ہائے اللہ، ڈیڈی کو میری ضرورت نہیں۔ امّی کو بھی نہیں۔ منّو کو ــــ چنّو کو ــــ رابی منی ــــ پنکی ــــ یہ سب مجھ سے کٹے کٹے رہتے ہیں کیا سچ میں بہت بُری ہوں ــــ؟

ہاں چنّو کہتا بھی تو تھا کہ دیکھ لینا ایک دن تم اتنا دکھ اُٹھاؤ گی ــــ اُف تمھاری زبان ہے کہ قینچی ــــ اور توبہ ــــ کہیں لڑکیاں بھی اتنی شرارت کرتی ہیں ــــ؟؟ اور اب امّی ــــ ڈیڈی ــــ ... بھائی جان

۔ کوئی مجھے نہیں چاہتا ___ کوئی نہیں ___ اُف ......

پھر ایک دن ڈاکٹر صاحب کمرے سے باہر نکلے اور ابا کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ابا نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہیے، ڈاکٹر صاحب اب کیا حال ہے بچی کا؟"

ڈاکٹر صاحب بولے۔ "شریر بچے بہت ذہین اور بہت حساس بیمار ہوتے ہیں پروفیسر صاحب۔ میرے خیال سے اب آپ کو اور بیگم صاحبہ کو کبھی نہ کبھی یہ ماننا نہ ہوگی کہ رانی بٹیا شرارتی ہے، ضدی ہے، کسی کا کہنا نہیں مانتی۔ یہ نفسیاتی طور پر اس کے دل میں اتر چکا ہوں، اب اس وقت تو اسے صرف آپ کے ذرا سے پیار کی ضرورت ہے۔ اتنے دنوں سے جو افسوس کر چکے ہیں اس کا بہہ نکلنا بھی ضروری ہے۔"

ڈیڈی لپک کر اٹھے اور پردے کے پاس جاکر پوچھا۔ "کیوں بی بی اب کے ہفتے تمہارے مارکس بہت کم ہیں کیا بات ہے؟!"

اتنا سننا تھا کہ بی گڈی بے تابی سے اٹھیں اور ڈیڈی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "آپ ہی نے محبت اور توجہ چھوڑ دی۔ تو پڑھائی میں خاک جی لگتا ...... امی بھی دور دور رہتی تھیں۔ اور سب ... بھائی جان ..." ہچکیاں منہ سے آواز نہ نکلنے دیتی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب ڈیڈی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے ___ اور گڈی کہے جا رہی تھی۔

" اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شرارت اتنی بڑی چیز ہے کہ امی ڈیڈی سے ٹوٹ جانا پڑتا ہے تو ـــــ تو ـــــ ہم کبھی بھول کر بھی شرارت نہ کرتے ۔"

ہائے بے چاری ! وہ موٹی گوری گوری گڑیا اس وقت کیسی دبلی اور زرد نظر آرہی تھی ـــــ ! اور یہ سب کچھ تین چار ہفتوں میں ہی تو ہوا ـــــ ۔ ڈیڈی نے ذرا سا مسکرا کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھا ۔ اور بے بی کو گلے لگاتے ہوئے بولے ۔

" سچ مچ اب اچھی بچی بن جاؤ گی ۔ "

" جی ہاں ـــــ " وہ آنسو پونچھ کر بولی ۔ " اور وہ تین سو روپے ہم پر اُدھار سمجھئے ـــــ ڈاکٹر بن جاؤں گی تو پہلی تنخواہ آپ کے ہاتھ میں لا کر رکھ دوں گی ـــــ "

" اچھا اچھا " ڈیڈی پیار سے بولے " بہت تیز ہے ماشاء اللہ "

پیچھے سے چنو نے جلا بھنا طعنہ چھوڑا ۔

" بھلا بلبل ہزار داستان چہکنا چھوڑ سکتی ہے ؟! "

ماہر باورچن

بھئی بچپن میں ہمیں بھی آپ ہی کی طرح گڑیاں کھیلنے اور ہنڈ کلیا پکانے کا بے حد شوق تھا ـــــ اور چونکہ دو چار بار گھر والوں اور باہر والوں نے ہمارے ہاتھ کے پکائے کھانوں کی تعریف بھی کر دی تھی اس لئے ہم یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں ہم سے بڑا باورچی کوئی نہیں ـــــ اسکول میں پکوان کا بھی ایک پیریڈ ہوتا تھا اور ہم وہاں سے بڑے اچھے اچھے پکوان سیکھ کر گھر میں اپنی دھاک بٹھایا کرتے!

ایک دن خالہ جان کے ہاں ہم سبھوں کی دعوت تھی ـــ کھانے پر یوں تو کئی قسم کے آئٹم بھی تھے اور نئے نئے سالن بھی ـــ مگر ایک سالن ایسا تھا کہ سب اُسی پر جُٹے ہوئے تھے ـــ ہم نے بھی اُسے چکھا۔ اور بہت ہی لذیذ معلوم ہوا۔ بازو بیٹھی رابعہ (خالہ جان کی نک چڑھی بیٹی) سے پوچھا ـــــ

کیوں بھئی یہ کاہے کا سالن ہے؟" ـــــ

وہ بھویں چڑھا کر بولی —— "ارے —— پائے کا اور کاہے کا
—— کیوں تم نے کبھی نہیں کھایا؟" ——

میں چڑ کر بولی —— "ارے واہ کھایا کیسے نہیں۔ ہزار بار کھایا اور
پکایا بھی" —— (حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پہلی بار کھا رہے تھے)

"کس نے سکھایا" —— وہ حیرت سے بولی ——

"کس نے سکھایا؟" میں تیزی سے بولی —— "ارے ہمارے اسکول
میں پکوان سکھائے جاتے ہیں کہ نہیں —— وہیں سیکھا" ——

رابعہ ذرا اڑ گئی —— "ہمیں تو نہیں آتا بھئی۔ —— کم بخت! تم چیلہ کا
گلے ہی نہیں ——"

"شاید تمھیں پکوان سے دلچسپی نہ ہو" —— میں نے اس انداز سے کہا!
جیسے میں دنیا کی سب سے اچھی سب سے ماہر باورچن تھی۔

اس نے بیٹھے بٹھائے ایک نئی تجویز پیش کر دی۔

"تمھارے پاس گڑیا ہے؟" ——

"ہاں ہے تو ہی —— پھر؟" ——

"تو یوں کریں گے کہ ہم اپنے گڈے کی شادی تمھاری گڑیا سے کریں گے۔
اور تم شادی کے دن براتیوں کی تواضع اپنے ہاتھ کے پکائے ہوئے پائے
کے سالن سے کرنا —— ہاں —— ؟"

بھلا ہمیں کیا عذر ہو سکتا تھا —— ہم نے فوراً تجویز مان لی ——

دسترخوان پر اور بھی گھر کے بڑے لوگ تھے — کچھ ہماری باتیں بھی سنتے جا رہے تھے — ایک پھوپھی ہماری تعریف میں نانی اماں سے کہہ رہی تھیں —

"خالہ جان — واقعی آپ نے اپنی لڑکیوں کی خوب تربیت کی ہے — اتنی سی عمر دیکھو اور سب کچھ پکانا آتا ہے —"

ہم اپنی تعریف کے مارے پھولے جا رہے تھے اس لئے موقع میں آکر سبھی لوگوں کو دعوت دے ڈالی کہ ہم نے اپنی گڑیا کی شادی مقرر کی ہے۔ آپ لوگ بھی رونق بڑھائیں — سب کو بھلا کون ایسی رکاوٹ تھی۔ سب نے دعوت قبول کر لی —

دعوت کے دن ہم ذرا بھی پریشان نہ تھے..... پریشانی کی بات بھی کیا تھی؟ پریشان تو وہ ہوتے ہیں جنہیں پکانا نہیں آتا.... دوسری بہنیں اور ہمارے بھائی تو شادی کے انتظام میں لگ گئے اور ہم نے چولھے کا رخ کیا..... سب سے پہلے تو ہم نے ایک کلہاڑی لی اور ایک بھائی کی مدد سے سونے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ اب سوال تھا کہ کون سے پلنگ کے پائے پکائے جائیں — وہاں خالہ جان نے ہاں ہم نے کہیں یہ بھی سنا تھا کہ چھوٹے پائے زیادہ مزے دار ہوتے ہیں — اب ہم اسی دھن میں تھے کہ بچے کا پلنگ توڑیں یا پھر ننھو ننھے کے پلنگ کی خبر لی تو پتہ چلا کہ کھٹمل بہت بھرے ہیں —

توبہ ـــ بھلا برائی کیا سوچیں گے؟

شتو کے پلنگ پر گئے تو وہ بہت ہی چھوٹا پلنگ تھا ـ اتنے سارے براتیوں کو بھلا اتنے سے پائے کیسے کافی ہو سکتے تھے ـــ؟ تنگ آکر ہم نے خود نانی اماں کے پلنگ کے پائے پکانے کی سوچ لی۔

نانی اماں کا پلنگ اصل ساگوان کی لکڑی کا تھا اور بڑا بھی تھا ـــ ہم نے اللہ کا نام لے کر کلہاڑی چلوادی اور جناب ڈھیر بھر پائے دیکھتے ہی دیکھتے تیار ہو گئے ـــ اب ہم نے تمام پائے اٹھا کر بڑے سے پتیلے میں ڈالے۔ اور انھیں خوب صاف دھلوایا ـــ دوسرے پتیلے میں بہت سا تیل، پیاز، مرچ اور مسالہ ڈال کر پائے بگھار دیئے اور نمک ڈال کر ڈھکنا ڈھانک دیا ـــ

اب بھئی پائے ایسی چیز تو ہیں نہیں کہ یوں ہی جلدی سے گل جائیں۔ ہم اپنی ہانڈی چولھے پر چھوڑ، ادھر شادی کے دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گئے ـــ شام ہوتے ہوتے ہماری سمدھن بھی اپنے بیٹے (گڈے) کو لے کر آگئیں ـــ اور سارے گھر میں خوب دھوم ہو گئی ـــ

اب چونکہ خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس لئے ہم کو پایوں کی دھن سوار ہو گئی۔ جا کر ڈھکنا کھولا تو دیکھا کہ پائے عزت سے کھد بد کر رہے ہیں۔ چمچے میں لے کر دیکھا تو گلنے کا پتہ ہی نہ تھا ـــ سخت وحشت سوار ہوئی کہ خداوندا اب کیا کریں ـــ کیونکہ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔

اور اب تھوڑی ہی دیر میں کھانے کا غلغلہ اٹھنے والا تھا ــــ

ہم نے ماما سے کہا کہ خوب اچھی آنچ لگائے تاکہ پائے جلدی سے پک سکیں ــــ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ پر آنکھوں میں حیرت سی بھرے ہمیں گھورنے لگی ــــ نہ رہا گیا تو اتنا ہی بولی۔

"دوئی بی بی، کہیں پائے یوں پکتے ہیں؟"

بھلا ہٹ تو سر پر سوار تھی ہی ــــ میں الجھ کر بولی ــــ

"اب تم باتیں نہ بناؤ ــــ جو میں کہتی ہوں وہی کرو"ــــ

وہ بے چاری سر جھکا کر چولھے میں پھونکیں مارنے لگی ــــ

دو تین چکر لگا کر پھر جو باورچی خانے کی خبر لی تو پائے اپنی سابقہ حالت سے ایک انگل بھی آگے نہ بڑھے تھے۔

"ہائے خدا اب ہوگا کیا ــــ؟" بس رہ رہ کر یہی خیال ستا رہا تھا ــــ

اک دم صحن اور برآمدوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ بھئی بہت رات ہوئی جا رہی ہے ــــ ہمیں دور جانا ہے ــــ کھانا کب لگاؤ گی ــــ؟"

بوکھلا کر پھر باورچی خانہ کو دوڑے ــــ پائے تو قسم کھا چکے تھے کہ ہم آج گلیں گے ہی نہیں۔ چاہے تم کچھ ہی کر لو ــــ خالہ جان کے ہاں کے پائے تو اس قدر اچھی طرح گلے ہوئے تھے کہ حد نہیں ــــ بھلا زلیخہ کیا سوچے گی کہ کیسا اسکول ہے جہاں گوشت گلانے کا طریقہ

بھی نہیں سکھایا جاتا ــــ ؟

پھر سوچا ــــ اونہہ ہوا ہی کیا ــــ نہ سہی پائے شوربہ ہی کھالیں گے ــــ اور جو پائے کے بہت ہی شوقین ہیں تو دانتوں کو کام میں لائیں، آخر خدا نے دانت اور کس دن کے لئے دیئے ہیں" ــــ ؟!

چلئے صاحب ! ــــ دسترخوان بچھا ــــ کھانا چُنا گیا اور سب بلوائے گئے ــــ اب جو سب اپنی اپنی رکابیوں میں پائے کا سالن لیتے ہیں تو رکابیوں میں پائے یوں کھڑکھڑ بج رہے ہیں جیسے لکڑی کے ٹکڑے ــــ سب نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کیا ــــ

" ارے یہ کیا ہے ؟" ــــ

" ارے بھئی یہ کیسا سالن ہے ؟" ــــ

" بھئی اسے کیسے کھائیں ؟" ــــ

جتنے منہ اتنی ہی بولیاں ــــ ہم اپنی جگہ کھسیائے جا رہے تھے ــــ اک دم وہی خالہ جان (جن کے ہاں پائے کھائے گئے تھے ــ عمر میں پہلی بار ــ) بولیں ــــ

" بیٹی تم نے یہ کیسا سالن پکایا ہے ؟"

نانی اماں بولیں ــــ اور پائے تم نے کس کے ہاتھ سے منگوائے تھے ــــ ؟"

" منگوائے تھے ؟؟" ــــ میں حیرت سے بولی ــــ " منگوانے کی

کیا ضرورت تھی! گھر میں اتنے سارے پلنگ ہیں تو باہر سے کوئی منگوانا؟"۔۔۔

"ہائیں"۔۔۔ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں ۔۔۔ تو تم نے پلنگ کے پائے پکائے ہیں؟"۔۔۔

"تو پائے پھر اور کاہے کے ہوتے ہیں؟"۔۔۔ میں حیران ہو کر بولی۔

اک دم اتنے سارے قہقہے کانوں سے ٹکرائے کہ بہرے ہونے کی نوبت آگئی اور میں کچھ نہ سمجھ سکی۔۔۔

(آپ سمجھ گئے نا! بات دراصل کیا تھی؟)

اب اتنے دن گذر جانے پر کوئی پوچھتا ہے ۔۔۔ "ہاں واجدہ بی بی! تمھیں کھانا پکانا آتا ہے؟"۔۔۔ تو اس قدر کھسیا ہٹ سوار ہوتی ہے کہ حد نہیں۔۔۔

اس کہانی کا نتیجہ بس یہی نکل سکتا ہے کہ آپ اسکول میں سکھائے گئے پکوانوں کے بل بوتے پر خود کو ماہر باورچن نہ سمجھ لیں۔۔۔

پاگل

"کوئی حد ہے آخر" رازی نے سر جھٹک کر کہا۔ "ہونہہ۔ جب دیکھو تب کتابیں۔ جب دیکھو تب پڑھائی بندہ تو بالکل عاجز ہو کر رہ گیا ہے۔ اور اب اس کا حل بھی سوچ لیا ہے۔"

کمرے میں بیک وقت کئی آوازیں گونجیں "کیسا حل ــــ؟ ذرا ہمیں بھی تو بتائیے ..!"

باہر باغ میں بڑے بھیا کرسی ڈالے ناول پڑھنے میں مشغول تھے۔ ایسی زور دار آوازیں سنیں تو ان کا سارا دھیان ادھر ہی لگ گیا۔ اندر سے رازی صاحب کی آواز آ رہی تھی۔

"حل ؟ کیسا حل ؟ ارے صاحب یہ بھی کوئی بڑی بات ہے اب سب کو پتہ چلے گا کہ مار مار کر کام لینے اور باندھ باندھ کر پڑھانے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟"

پھر وہی چوں چوں جیسی جیسی سی آوازیں ابھریں اور اب کی بار ذرا جھلائی ہوئی آواز میں ڈکی نے پوچھا۔

"ارے صاحب بتانا ہو تو بتا دیجئے، ڈنگیں مارنی تو سبھی کو آتی ہیں۔"
یہ وار رازی صاحب برداشت نہ کر پائے اور بھبھک کر بولے۔
"بندہ آج سے پاگل ہے۔"
"ہائیں پاگل" سب گھبرا گئے۔
"ہاں ہاں بھئی پاگل" رازی صاحب متانت سے بولے۔ "اس میں یوں حیرت کی کون بات ہے؟"
"تو جناب اس سے کیا فرق پڑے گا؟" گڑیا بولی۔
"وہ تو آپ دیکھ ہی لیں گی۔"
"پھر بھی کچھ بتائیے تو۔" گڑیا نے خوشامد سے پوچھا۔
"ارے بھئی بس یہی نا۔ جیسے اب امّی کہیں گی "بیٹے اسکول نہ جاؤ گے" تو ہم بیٹھے ان کا منہ تکا کریں گے۔ اگر بھائی جان نے کوئی کام بتایا تو زور زور سے ہنسنا شروع کر دیں گے۔" ماسٹر صاحب آیا کریں گے تو جھٹ الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دیں گے ـــــ کبھی کوئی قمیض پھاڑ ڈالی تو کبھی سیاہی کپڑوں پر گرا لی۔"
"ہے ہے خدا کے لئے کوئی نئی قمیض نہ پھاڑ ڈالنا بھیّا۔ روبی گھبرا کر بولی۔" آج کل تو کپڑا یونہی مہنگا ہو رہا ہے۔"
"ارے جناب ہم کوئی دیوانے ہیں؟، موقع محل دیکھ کر پاگل ہوا کریں گے۔" مجال ہے جو نئی قمیض یا پاجامہ کہیں سے پھٹ بھی جائے۔"

دبی دبی سرگوشیاں، اور پھر ہنسی اور پھر نت نئے سوالات ـــ بڑے بھیّا نے بور ہو کر ناول یونہی گھانس پر ڈال دیا اور خود اندر چل دیئے۔

"اور جو کھانے کا وقت ہوا کرے گا تو؟"

"تو مزے سے ہر چیز کھالیں گے نا بھیّا؟" روبی نے اپنی طرف سے ہی جواب گھڑ ڈالا۔

"ہنہ ایسا کیا میں پاگل ہوں۔ وہ تو گھر والے تبھی بھانپ جائیں گے پہلے پہل تو میں کھانے کی ہر چیز پھینک دیا کروں گا۔" رازی نے ہر چیز پھینکے جانے کے خیال سے افسردہ ہو کر کہا۔

"چ۔ چ۔ چ" سبھی افسردہ ہونے لگے۔ اب جانے کیا کھانے کو دیا جائے اور وہ پھینک دیا جائے ہے نا افسوس کی بات ـــ"

"فرض کیجئے کسی دن آپ کو آئسکریم دی جائے تو؟"

"ہا ـــ" رازی نے ایک گز لمبا سانس بھرا "وہ بھی پھینک دینی پڑے گی۔"

"اور کبھی چاکلیٹ دیئے گئے تو!"

رازی کی بشاشت لوٹ آئی۔ "وہ تو بڑی اچھی بات ہوگی جی ـــ چاکلیٹ کوئی آئسکریم تھوڑی ہی ہیں کہ جھٹ پٹ گھل جائیں وہ میں اِدھر اُدھر پھینک دوں گا اور پھر بعد کو سمیٹ لیا کروں گا۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔" روبی کو اپنے بھائی پر حد درجہ ترس آ رہا تھا۔

" اور بھیّا ہاں میں امّی سے کہہ کہہ کر آپ کو زیادہ تر چاکلیٹ ہی دلوایا کروں گی۔"

اکرم سے ڈکی نے ایک روح فرسا منظر پیش کر دیا۔

" اور جو کبھی امّی یا ڈیڈی نے آپ کو پاگل خانہ بھجوا دیا تو۔"

ہائے غضب ـــــ! رازی صاحب پاگل ہوتے ہوتے بچے اور روبی، گڑبڑا رونے پر اتر آئیں۔

" ہائے بھیّا آپ تو پاگل خانہ بھجوا دیئے جائیں گے ـــــ! "

رازی نے صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے سینہ ٹھونکا۔

" ارے گرتے ہیں شہسوار ہی....."

ڈکی، وقار، اسلم وغیرہ نے جھٹ مصرعہ اٹھایا ـــــ میدانِ جنگ میں۔

" وہ تو یقیناً گرتے ہوں گے۔" روبی الجھ کر بولی۔ " مگر وہاں آپ پاگلوں کے بیچ رہیں گے کیسے ـــــ؟ "

" میں ان کے اسکیچ بنا کر وقت گذارا کروں گا ارے یہ کون سی رونے کی بات ہے ـــــ! اور پھر کچھ دن بعد تو غالباً امّی ڈیڈی واپس بلوا ہی لیں گے ـــــ"

" مگر قبلہ کتنے دنوں کے لئے آپ نے یہ پروگرام بنایا ہے؟" اسلم سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"بھی بس اپنے امتحان ختم ہو لیں ـــــ روز پڑھائی، روز پڑھائی، دن کو پڑھائی رات کو پڑھائی۔ سونے سے پہلے پڑھائی، سونے کے بعد پڑھائی۔ واللہ بھیجا آؤٹ ہے اپنا ـــ اُدھر امتحان ختم اِدھر اپنا پاگل پن ختم۔"

"مگر اگلے سال تو پڑھنا ہی پڑے گا نا؟" گڑیا عبرت انگیز لہجے میں بولی۔

" جب کی جب دیکھی جائے گی۔ تین مہینے کا ریسٹ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔

دوسرے دن گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔

ہوا یہ کہ حسب معمول جب شام کے چھ بجے انگریزی پڑھانے والے ماسٹر آئے تو رازی نے انتہائی ذہین لڑکا ہونے کے باوجود بھی ہر بار Moon کے معنی سورج بتائے milk کے معنی پانی ـــ اور child کے معنی بوڑھا ـــ پہلے تو ماسٹر صاحب سمجھے شریر بچہ ہے مذاق کرتا ہوگا۔ مگر رازی تو ہر بار اوندھے ہی جواب دیتا گیا۔ آخر جب عاجز آکر ماسٹر صاحب نے ایک آدھ دھموکا جڑا تو رازی نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی۔ اور ایک کے بدلے تڑاتڑ کر کے ماسٹر جی کی پیٹھ کر دس گن دیئے۔

ہائے غضب ـــ بھلا کسی شاگرد نے ماسٹر کے دھپے جڑے ہوں گے ـــ ؟؟ ماسٹر صاحب نے چیخنا شروع کردیا ـــ ادھر

اُدھر سے گھر کے سارے بزرگ جمع ہو گئے۔ ڈیڈی کی پریشانی اور امّی کے آنسو قابل دید تھے۔ اُف بے چارہ رازی پاگل ہوگیا ـــ! کتنا ذہین ـــ کتنا چالاک، کتنا پڑھاکو لڑکا تھا! اور صرف گیارہ سال کی عمر میں اتنا اچھا آرٹسٹ بھی! اس سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں۔ اور کیا ہوگیا ـــ!

ڈیڈی نے جب رازی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور اس کا مزاج پوچھنے لگے تو رازی بے تحاشا قہقہے لگانے لگا۔ ہاہا کر کے آسمان ہی سر پر اُٹھا لیا۔ "ہائے میرا بچہ۔ موئی کم بخت پڑھائی جب دیکھو تب کتابیں جب سنو تب کتابیں۔ ہائے یہی حشر ہونا تھا۔ اب میں کیا کروں گی خداوند میرے بچوں میں سب سے ذہین یہی تو تھا۔ ماسٹر صاحب تو کہتے تھے اسے جلدی لندن بھجوا دیں گے۔ اب کون لندن جائے گا؟ اب میں کیا کروں؟ وہ ہاتھ مل مل کر دہائیاں دینے لگیں۔

ڈیڈی نے پریشان ہو کر سر ہاتھوں میں دبوچ لیا!

شام تو یوں گزری رات کے کھانے پر بھی رازی نے خوب اودھم مچایا۔ ایک دو پلیٹیں پھینک دیں (مگر تمام چینی کی تاکہ پھوٹنے نہ پائیں) سالن ٹیبل پر اوندھا دیا۔ روٹیاں پانی کے جگ میں ڈبو دیں۔ البتہ جب میٹھا سامنے آیا تو ساکن ہو گئے۔

امّی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ "ہائے میرے بچے کو میٹھا کس قدر

پسند تھا۔"

بڑے بھیا دکھ سے بولے۔" میٹھا دیکھ کر بچارے کو ماضی یاد آرہا ہوگا!"

اتنے میں رازی نے میٹھے کی پلیٹ اُٹھا کر اپنے سر میں الٹ دی تھی اور اب یہ حال تھا کہ کیلے اور پھلوں کے قتلے تو بالوں کے جنگل میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ مگر دودھ ان کے چہرے کو دُھلاتا قمیض کو بھگو رہا تھا۔

ڈیڈی نے بوکھلا کر ڈاکٹر صاحب کو فون کیا اور امی نے یہ سمجھ کر، کہ گرمی سے دماغ پریشان ہو گیا ہوگا۔ اسی وقت ٹھنڈے پانی سے نہلوا کر صاف کپڑے پہنوائے۔

ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی رازی نے وہی ہنگامے اٹھائے ـــــ وہ نبض دیکھنی چاہتے تو ان کی انگلیوں پر کاٹ کھاتے (ڈاکٹر صاحب جو ہمیشہ کڑوی دوائیاں اور تیز انجکشن بھونکتے رہے اس کا بدلہ چکانا بھی تو ضروری تھا) تھک ہار کر ڈاکٹر صاحب بیٹھنے کو ہوئے تو پیچھے سے کرسی گھسیٹ لی اور ڈاکٹر صاحب مع اپنی ڈاکٹری کے زمین پر! بے چارے کھسیانے تو بہت ہوئے۔ مگر واسطہ پاگل کا تھا کیا کرتے ـــــ؟ ان کی دماغی حالت کا اندازہ لگانے کو دن بھر کے واقعات پوچھے گئے کہ آیا رازی میاں کے ساتھ کوئی تکلیف دہ بات تو نہیں ہوئی۔ سب باتیں

پوچھ لی گئیں مگر نتیجہ وہی رہا۔ امّی کی آنکھ کا آنسو نہ تھمتا تھا۔

بہت مشکلوں سے رازی کو بستر پر لٹایا گیا تو دو ایک منٹ تو چپکے پڑے رہے۔ پھر ایک دم تکیوں کو نوچنا شروع کر دیا۔ چادر اٹھا کر پھینک دی) اور گدیلے کو نوچ کر اس میں سے روئی برآمد کرنے لگے۔ اور بکنے لگے

"امّی یہ آئسکریم اتنی گرم کیوں ہے ـــــ؟"

جنون اتنا بڑھا کہ چلّا چلّا کر رونے اور روتے میں ہنسنے لگے۔

"ڈاکٹر صاحب آخر مرض کے اسباب کیا ہوں گے ـــــ" ڈیڈی نے تشویش سے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ رازی کے پچھلے ریکارڈ سے واقف تھے اس لئے سر کھجا کر بولے "میں سمجھتا ہوں پڑھائی، مسلسل پڑھائی سے سر پھر گیا ہے۔" امّی بپھر کر بولیں۔ "آگ لگے موئی پڑھائی کو ـــــ اب میرا لال اچھا ہو لے۔ ذرا کتاب کو چھو تو لے۔ ساری کتابیں جلوا دوں گی۔ زندگی سے بڑھ کر پڑھائی تو ہے نہیں۔" (کس قدر دل خوش کن جملے ہیں خداوند ـــــ رازی نے دل ہی دل میں سوچا!)

ڈاکٹر صاحب کے مشورے سے رازی کے سر پر برف رکھی گئی اور کھانے کو آئسکریم پیش کی گئی۔ رازی نے ٹھنڈی سانس بھر کر آئسکریم سر پر انڈیل لی۔ جو سر پر سے ہوتی ہوئی کچھ منہ کے اندر بھی جاتی رہی (میٹھا پھینکنے کا یہ طریقہ بہت کارآمد تھا کہ کچھ نہ کچھ تو منہ میں پہنچ ہی جاتا تھا)

بہت مشوروں کے بعد یہی طے پایا کہ رازی کو دوسرے بچّوں سے الگ کر دیا جائے۔ سوائے پاگل خانے کے اور کہاں بھجوائے جا سکتے تھے؟ بچّوں کا حال تباہ تھا کہ اُن کے پیارے رازی بھیّا چلے جا رہے ہیں۔ اور امّی کا تو پوچھئے ہی نہیں۔ دوسرے دن بھی رازی کی وہی حرکتیں تھیں۔ نہ منہ دھویا نہ کپڑے بدلے۔ بیٹھے منہ اچکاتے رہے۔ یا بندروں کی طرح اُچکتے رہے۔

"امتحان کو صرف تین ماہ رہ گئے ہیں۔ کاش رازی اس وقت پاگل نہ ہو جاتا۔" بڑے بھیّا افسوس کے ساتھ بولے۔

امّی چڑ کر بولیں۔ "پھر وہی امتحان کا رونا ـــــ جان سے بڑھ کر پڑھائی ہو گئی یہاں تو۔ اللہ بچائے ایسی تعلیم سے کہ دماغ ہی الٹ جائے۔"

رازی نے وحشی پن سے امّی اور بڑے بھیّا کو دیکھا اور پھر ہنس ہنس کر اُچکنے لگا۔

کس قدر برا دن تھا وہ ـــــ! رازی پاگل خانہ بھجوایا جا رہا تھا۔ گھر پر اس قدر ویرانی چھائی ہوئی تھی، در و دیوار روتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور سارے بچّے اس قدر غمگین تھے! امّی نے ایک بکس میں رازی کے کپڑے رکھ دیئے تھے اور ساتھ میں بستر بھی دے دیا تھا۔ ایک باسکٹ میں پھل پھلاری اور پھر ان کے پسندیدہ کھلونے ـــــ سب چیزیں دیکھ دیکھ کر سبھی کو رونا آ رہا تھا ـــــ اس وقت سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

پورٹیکو میں کار کھڑی کر دی گئی۔ عجب خاموشی تھی! اتنے میں بڑے بھیّا اُٹھے اور اداسی سے رازی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "جانے سے پہلے بے چارے کو اس کے پسندیدہ ریکارڈ ہی سُنا دوں شاید ماضی یاد آ جائے۔"

تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم کی خاموش فضا میں بم جیسا گرا۔

"مگر قبلہ کتنے دنوں کے لئے آپ نے یہ پروگرام بنایا ہے؟"

رازی کی آواز گونجی۔ "یہی بس اپنے امتحان ختم ہو لیں۔ روز پڑھائی روز پڑھائی، دن کو پڑھائی، رات کو پڑھائی، سونے سے پہلے پڑھائی، سونے کے بعد پڑھائی، واللہ بھیجا آؤٹ ہے اپنا، اُدھر امتحان ختم اِدھر اپنا پاگل پن ختم۔"

سمجھے آپ! بڑے بھیّا نے ٹیپ ریکارڈ پر ان لوگوں کی اس دن کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ نہ پوچھئے ورنہ رازی میاں مارے شرمندگی کے سچ مچ ہی پاگل ہو جائیں گے!

لنچ

جھاگ کی طرح سفید بال ـــ کاموں کی زیادتی سے جُھکے ہوئے اعضا ـــ خون کی کمی سے ہلکی پیلی رنگت ـــ بڑی بڑی لیکن نم آلود آنکھیں ـــ چہرہ! محبت اور شفقت سے بھرپور، بیک وقت مُسکراتا روتا سا چہرہ۔

یہ تھیں میری نانی آماں۔

میری ماں میری نانی آماں کی اکلوتی اولاد تھیں ـــ شادی کے تین سال کے اندر ہی نانی اماں بیوہ ہوگئیں اور پھر ساری عمر، ساری بیوگی اسی ایک بیٹی کے سہارے اُنھوں نے کاٹی، لیکن نانی آماں ایسی نصیبوں کی پوری تھیں کہ میری ماں اپنی بھرپور جوانی میں ہم آٹھ بہن بھائیوں اور شوہر کو نانی آماں کے سہارے چھوڑ کر خود مزے سے اللہ میاں کے یہاں چلی گئیں۔ (دو سال بعد ابّو بھی امّی سے جا ملے) اب نانی اماں تھیں ـــ اکیلی۔ بے سہارا۔ غریب۔ بوڑھی۔ اور ہم آٹھ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن جن میں سب سے چھوٹی صرف چالیس دن کی تھی۔ ابّو کے انتقال کے وقت میں تین سال کی تھی اور چھوٹی دو سال کی۔

ہائے ری غریبی! نانی اماں کو کس قدر کام کرنے پڑتے تھے ـــــ کبھی بچّوں کے کپڑے دھو رہی ہیں ـــــ کبھی روٹی پکا رہی ہیں ـــــ کبھی برتن دھو رہی ہیں ـــــ شام ہونے پر چراغوں میں تیل بھر کر کمروں کمرے گھوم گھوم کر یہاں وہاں روشنی بکھیرتی پھر رہی ہیں ـــــ ذاتی بڑا سا مکان تھا ـــــ دو منزلہ ـــــ بڑے بڑے آنگنوں میں جھاڑو لگاتی پھر رہی ہیں ـــــ یہ سب تو تھا، لیکن نانی اماں کبھی کھانا کھاتی دکھائی دیتی ہی نہیں تھیں ـــــ ہم لوگ ذرا بڑے ہوئے تو اِس بات کی ذرا کھوج سی لگ گئی ـــــ

"نانی اماں آپ اتنی محنت کرتی ہیں۔ اتنا سارا کام کرتی ہیں آخر آپ کھانا کیوں نہیں کھاتیں ـــــ؟"

"ارے واہ ـــــ بغیر کھانا کھائے کوئی دنیا میں زندہ رہا ہے ـــــ"

"پھر آپ ہمیں کھانا کھاتی دکھائی کیوں نہیں دیتیں ـــــ"

"دیکھو بچّو ـــــ" وہ ہمیں قائل کرتیں۔ "زیادہ کام کرنیوالے کو کھانا بھی اچھا، بہوت (وہ بہت پر زور دے کر بہوت کر دیتیں) اور طاقت والا چاہیئے نا ـــــ"

ہم ہاں کہتے تو وہ سمجھاتیں ـــــ "تو دراصل میں بھی بہت اچھا، بہت سارا، بہت طاقت والا کھانا کھاتی ہوں۔ اور میرے کھانے کا وقت دوپہر میں ہوتا ہے۔ جیسے تم اسکول والے بچے "لنچ" کہتے ہو نا ـــــ؟

www.taemeernews.com

تو بھئی میں لنچ میں اس قدر بہوت سا ثقیل کھانا کھا لیتی ہوں کہ وہ دن بھر ہضم ہی ہوتا ــــــ اور جب کھانا ہضم ہی نہیں ہو گا تو بھوک کیا لگے گی بس اسی لئے میں دن میں صرف ایک بار ہی کھانا کھاتی ہوں۔"

تیسرے نمبر کے جو بھائی تھے، بھولے قسم کے تھے۔ مگر چھوٹے والے بڑے کائیاں ــــــ کسی بات کی تسلی نہ ہوتی تو آخر تک بھیجا چاٹے جاتے ــــــ ذرا غیر یقینی انداز سے بولے" اور آپ کے لنچ میں ہوتا کیا ہے ؟"

نانی اماں نے گنوانا شروع کیا۔" یہی زیادہ نہیں بس دو انڈے۔ گوشت ــــــ اصلی گھی ــــــ ایک آدھ میٹھا چاول۔ چپاتیاں۔ قیمہ۔ کبھی نان....."

" مگر نانی اماں" وہ منہ بسور کر بولے۔" ہمیں تو یہ ساری چیزیں سال میں دو تین بار بس عید پر ملتی ہیں اور آپ روز کھاتی ہیں !"

"ہاں بیٹا مجھے تو یہ سب کچھ روز کھانا ہی پڑتا ہے۔ تم ہی لوگ تو کہتے ہو کہ نانی اماں آپ اتنا کام کرتی ہیں کمزور ہو جائیں گی آپ اچھے سے اچھا کھانا کھایا کیجئے ــــــ"

وہ باقاعدہ رونے کے موڈ میں آ کر لمبے لمبے لوٹ گئے ــــــ "ہمیں تو بس ناشتے میں ایک کپ چائے مل جاتی ہے۔ لنچ میں آپ تھوڑا سا سالن ایک سوکھی روٹی میں لپیٹ کر اسکول کے لئے دے دیتی ہیں۔ اور رات میں وہی دال چاول اور خود..... ایں ــــــ ایں ــــــ ایں"

www.taemeernews.com

منجلے بھیّا نے سمجھایا۔ ارے پاگل نانی آماں کو اچھا کھانا کھانا ہی چاہیئے۔ ورنہ اگر اللہ نہ کرے وہ کمزور ہو کر بیمار پڑ گئیں تو اتنے سارے آٹھ آٹھ بچّوں کا کام کون کرے گا؟ کون پالے گا ــــ"

" دیکھو تو سہی ــــ" نانی آماں روہانسی ہو کر بولیں ــــ "میرے کھانے کو ٹوکتا ہے ــــ میں بوڑھی کم زور ــــ اچھا نہ کھاؤں تو اتنے سارے کاموں کے کرتے کرتے مر نہ جاؤں ــــ"

اتوار کو سبھی بچّوں کی چھٹّی رہتی۔ اس دن نانی آماں ہمیں لوگوں کے ساتھ ہمارا والا ہی لنچ کھا لیا کرتیں ــــ اکیلے پکانے کی جھنجھٹ میں نہ پڑتیں ــــ ہاں باقی دن ان کا لنچ ہم سے الگ ہی پکتا۔ ویسے اتنی بات ہم سب ہی نوٹ کرتے کہ اتوار کے ایک دن بھی اُن سے ہمارا والا لنچ ذرا مشکل سے ہی کھایا جاتا ــــ کبھی اپنی پلیٹ کا آلو اٹھا کر کسی کی پلیٹ میں ڈال رہی ہیں۔ قسمت سے گوشت ان کی پلیٹ میں ہوتا تو اپنی پلیٹ سے گوشت کی بوٹی اٹھا کر کسی نہ کسی کی پلیٹ میں چپکے سے رکھ دیتیں ــــ سب بچے بعد میں آپس میں بولتے ــــ

" نانی آماں کو اچھا کھانے کی عادت پڑ گئی ہے نا ــــ دیکھو نا آج اپنی بوٹی میری پلیٹ میں ڈال دی ــــ انھیں کو فتوں کی یاد آئی ہو گی تو سادی بوٹی بھلا کیا کھائی جاتی ــــ ؟"

www.taemeernews.com

"دیکھا نانی امّاں نے آج اپنی پلیٹ کا پورا سالن یہ کہہ کر رکھ دیا کہ رات کو بڑے بھیّا مانگیں گے۔"

"بڑے گھروں کے بچّے اچھّا اچھّا کھا کر زیادہ ہی ندیدے بن جاتے ہیں۔ غریبوں کے بچّے روکھا سوکھا کھا کر صابر بن جاتے ہیں پھر بھی آخر کتنا صبر ——" ایک دن بچّوں نے طے کیا کہ آج اسکول سے آدھے دن کی چھٹی لے کر اچانک دھاوا بول دیا جائے اور نانی امّاں کے لنچ میں سے حصہ اڑایا جائے۔

وہ ایک بڑی ہی سائیں سائیں کرتی دوپہر تھی —— ہم بہنوں نے اپنے اسکول سے اور بھائیوں نے اپنے اسکول سے آدھے دن کی چھٹی مانگی اور تپتی دوپہر میں لذیذ کھانوں کے تصور میں اُچھلتے کودتے گھر پہنچے —— عین نانی امّاں کے لنچ کے وقفے میں !!

سامنے برآمدے میں دری پر نانی امّاں پیٹھ موڑے کھانا کھاتی بیٹھی تھیں —— ہم نے چپکے سے جا کر جھانکا ——

سامنے ایک پیالے میں بغیر دودھ کی سیاہ چائے رکھی ہوئی تھی۔ ایک رکابی میں سخت اور رُوکھی روٹی کے سُوکھے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ایک ٹکڑا روٹی کا اُٹھا کر سیاہ چائے میں بھگوتیں، نرم کرنے کے خیال سے تھوڑی دیر اُسے چائے میں پڑا رہنے دیتیں پھر اُسے نکال کر منہ میں ڈالتیں۔ اور اگر وہ پھر بھی نرم نہ ہو پاتا اور حلق سے اُتارنے

www.taemeernews.com

اتارنے میں مشکل ہوتی تو بار بار روتے ہوئے پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ بھر کر اسے مشکل نگل لیتیں۔

ہم لوگ چپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے ——— پوری زندگی کی داستان جیسے سامنے کھلی پڑی تھی ——— پتہ نہیں کیسے نانی اماں کو پتہ چل گیا کہ ہم لوگ پیچھے کھڑے ہیں ——— وہ گھبرا کر اپنا کھانا دوپٹے کے آنچل سے ڈھانکنے چھپانے لگیں، لیکن اب چھپا ہی کیا رہ گیا تھا ——— ؟

ہم لوگ خاموشی سے آکر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

آج جب خدا نے واقعی اپنی رحمتوں سے نواز دیا ہے اور لنچ پر دودھ۔ اصلی گھی۔ گوشت۔ انڈے۔ بریانی اور میٹھوں کی بھر مار رہتی ہے تو اکثر مجھے ایک تپتی ہوئی ویران دوپہر یاد آجاتی ہے۔ اور لاکھ روکنے پر بھی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں ——— ●●